جلد 5 شمارہ 5 جولائی 2003ء جمادی الاول 1424ھ

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ○ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ○ (الاعلیٰ 14-15)

بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا

اللہ

صداقت

محبت

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

ہے عرش بھی نیچا جو ہو پرواز سلسل
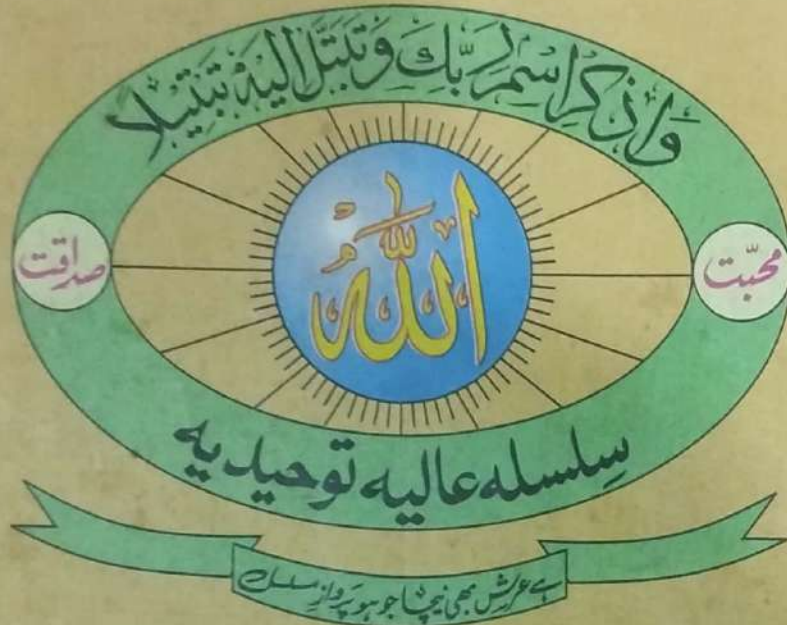
عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

ماہنامہ

فلاحِ آدمیت

گوجرانوالہ

Registerd

CPL No. 491

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

CamScanner

اغراض و مقاصد

- کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے مطابق خالص توحید، اتباع رسول ﷺ، کثرت ذکر، مکارم اخلاق اور خدمت خلق پر مشتمل حقیقی اسلامی تصوف کی تعلیم کو فروغ دینا۔
- کشف و کرامات کی بجائے اللہ تعالی کے قرب و عرفان اور اسکی رضا و لقاء کے حصول کو مقصود حیات بنانے کا ذوق بیدار کرنا۔
- حضور ﷺ کے صحابہ کی پیروی میں تمام فرائض منصبی اور حقوق العباد ادا کرتے ہوئے روحانی کمالات حاصل کرنے کے طریقہ کی ترویج۔

موجودہ زمانے کی مشغول زندگی کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت ہی مختصر اور سہل العمل اوراد و اذکار کی تلقین۔

- غصہ و نفرت، حسد و بغض، تجسس و غیبت اور ہوا و ہوس جیسی برائیوں کو ترک کر کے قطع ماسواء اللہ، تسلیم و رضا، عالمگیر محبت اور صداقت اختیار کرنے کو ریاضت اور مجاہدے کی بنیاد بنانا۔
- فرقہ واریت، مسلکی اختلافات اور لا حاصل بحثوں سے نجات دلانا، تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کی اہمیت کا احساس پیدا کر کے اپنی ذات، اہل و عیال اور احباب کی اصلاح کی فکر بیدار کرنا۔
- اللہ تعالی کی رضا، اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی اور ملت اسلامیہ کی بہتری کی نیت سے دعوت الی اللہ اور اصلاح و خدمت کے کام کو آگے بڑھانا۔ اپنے مسلمان بھائیوں کے دلوں میں قلبی فیض کے ذریعے اللہ تعالی کی محبت بیدار کرنا اور روحانی توجہ سے انکے اخلاق کی اصلاح کرنا۔

عالمگیر محبت، اکرام انسانیت اور فلاح آدمیت کا علمبردار

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

CamScanner

ماہنامہ

فروغِ آدمیت

گوجرانوالہ

عالمگیر روحانیت اور وحدتِ نوعِ انسان کی اسلامی تحریک کا علمبردار

بیادگار خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ

بانی سلسلہ

نگران و سرپرست

محمد صدیق ڈار صاحب توحیدی

شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ

جلد 5 شمارہ 5 جولائی 2003ء جمادی الاول 1424ھ

ایڈیٹر: وحید احمد

مجلس ادارت

محمد مرتضیٰ توحیدی، ایم محمد اکرم، پروفیسر منیر احمد لودھی، ایم محمد طالب ڈاکٹر عبدالرشید وقار، محمد صدیق، سید عاشق حسنین مرتضیٰ شاہ بخاری مولانا حافظ بشیر احمد

قیمت ــــــ -/15 روپے ـــ سالانہ فنڈ ــــــ -/150 روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:

محمد صدیق ڈار توحیدی

مرکز تعمیر ملت نزد وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ

Ph:0431-893535

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:

وحید احمد

تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ

Ph:0431-293379

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراج دین پرنٹرز جھگی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-431-222020

E-mail: tohidia@hotmail.com

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

CamScanner

اداریہ

اسلام کے پورے اعتقادی و عملی نظام میں بنیادی چیز توحید ہے۔ جس کا مطلب ایمان باللہ ہے۔ لیکن یہ عقیدہ صرف اس قدر نہیں ہے کہ "اللہ تعالیٰ موجود ہے" بلکہ وہ اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی جملہ صفات رکھتا ہے۔ اسلام کی رو سے کائنات اور اس میں پائی جانے والی ہر شے کا خالق اللہ ہے وہ جس کام کو چاہتا ہے ہو جاتا ہے۔ وہ خود بخود ہے، ہمیشہ سے ہے اور اسے کسی نے پیدا نہیں کیا۔ بلکہ سب کو اس نے پیدا کیا ہے۔ قرآن کی زبان میں " **قل هو الله احده الله الصمده لم يلد و لم يولده ولم يكن له كفواً احده** "(سورۃ اخلاص)

" کہہ دے کہ وہ اللہ تعالیٰ ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔ اور نہ کوئی اس کا ہم جنس ہے۔ "

اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ایمان باللہ کا مطلب یہ ہے کہ "الوہیت" کو کائنات کی جملہ اشیاء سے سلب کر کے، صرف ایک ذات کے لئے مخصوص کیا جائے۔ قرآن میں "الوہیت" کی مکمل وضاحت ہے۔ تمام عبادات واطاعت اس ذات کے لئے مخصوص ہیں۔ وہ قادر مطلق ہے۔ جس کا علم سب پر محیط، رحمت سب پر وسیع، طاقت سب پر غالب، حکمت میں اعلیٰ زندگی بخشنے اور وسائل حیات فراہم کرنے والا، نفع ونقصان کی تمام قوتوں کا مالک، وہی سب کا حساب لینے والا اور جزاء وسزا کا اختیار رکھنے والا، اللہ واحد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسلام مطالبہ کرتا ہے کہ اسی پر ایمان لایا جائے، عبادت کی جائے، توکل کیا جائے، وہی حمد وثناء کے لائق ہے۔ چنانچہ قرآن مجید جگہ جگہ اللہ کی ذات، صفات اور اختیار کا ذکر کر کے انسان کو بتاتا ہے کہ اس کائنات کے خالق نے کس طرح ایک معین نظام قائم کیا اور اس کے مقاصد کے تحت ہر شے کی حیثیت مقرر کی۔ قرآن کی زبان میں " خدا نے ہر شے کو پیدا کیا پھر اس کا اندازہ معین کیا۔ " (فرقان۔۵) " آسمانوں وزمین کی پیدائش اور رات ودن کے بدلنے میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ " (آل عمران۔۲۰) " کیا آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے "؟ (ابراہیم۔۲) " قرآن کہتا ہے کہ اس کائنات اور اس میں پائی جانے والے نظام کا خالق و

مالک حقیقی اللہ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں، قرآن کی زبان میں "جب اکیلا خدا پکارا جاتا ہے تو تم منکر ہو جاتے ہو اور جب کوئی شریک کرلیا جائے تو تم مان لیتے ہو" (مومن۔۲۰) "اگر آسمانوں و زمین میں کئی خدا ہوتے تو نظام عالم بگڑ جاتا۔" اس طرح جب اسلام زندگی و کائنات کا سب سے بنیادی عقیدہ توحید مقرر کرتا ہے تو اس سے انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں بے شمار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اول انسانی زندگی پر اس عقیدہ کا سب سے نمایاں اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان میں خودداری و عزت نفس پیدا ہوتا ہے۔ وہ تمام قوتوں کا مالک خدا کو مان کر بے شمار قوتوں کے خوف سے چھٹکارا حاصل کرلیتا ہے۔ ایک اللہ کی اطاعت اسے بے شمار اطاعتوں سے نجات دلا دیتی ہے۔ وہ بے خوف و خطر اپنے آپ کو صرف اللہ کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہے۔ خدا کے نائب کی حیثیت سے وہ کائنات میں ایک طرح سے برتر مخلوق کی حیثیت سے حکمرانی کرنے لگتا ہے۔ توحید کے تصور کے اجاگر ہوتے ہی تمام انسان مساوی حیثیت اختیار کرلیتے ہیں۔ ان کے درمیان امتیازات مٹ جاتے ہیں اور انسان انسان کی غلامی سے نجات حاصل کرلیتا ہے۔ وہ صرف اللہ کے سامنے جھکتا ہے۔ اس لئے انسان میں قوت ارادی، صبر و تحمل وغیرہ جیسی خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ انسان کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ اس نظریہ کے تحت نسل انسانی میں ایک طرح کا فکری اتحاد پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے عالمی اخوات کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ توحید پر ایمان انسان کو اللہ کے قانون کا پابند بنا دیتا ہے۔ اور انسان خلوت ہو یا جلوت میں اپنے ہر عمل کے معاملہ میں اپنا محاسب بن جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو چونکہ خدا کے سامنے افعال کا جوابدہ سمجھتا ہے۔ اس لئے غیر ذمہ داری، بداعمالی و ناانصافی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور انسان انفرادی و اجتماعی زندگی میں اپنے آپ کو ایک مرکز کے ساتھ منسلک کر کے اپنی زندگی میں ایک طرح کا توازن قائم کرلیتا ہے۔

والسلام

(وحید احمد)

درسِ قرآن

امانت

(حاجی مبارک علی)

''ہم نے امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کو دکھائی تو انہوں نے قبول نہ کیا کہ اسکو اٹھائیں اور اس سے ڈر گئے۔ اور انسان نے اسکو اٹھالیا۔ بے شک وہ ظالم اور جاہل ہے۔''

آیت کی رو سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں انہی نتائج کی رو سے ہم جائزہ لیں گے کہ وہ امانت کیا ہے جس کی وجہ سے اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے بھی یعنی خلیفۃ الارض ہوتے ہوئے بھی یہ ظالم اور جاہل ٹھہرا!

(1) امانت کیا ہے۔

(2) آسمان زمین پہاڑ یعنی پوری کائنات زندہ ہے۔

(3) کائنات کی ہر تخلیق سوچ اور سمجھ رکھتی ہے چاہے وہ پہاڑ ہی کیوں نہ ہو۔

(4) اللہ تعالیٰ کا ڈر ہر چیز میں موجود ہے۔

(5) ہر تخلیق میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

(6) انسان سب مخلوقات سے زیادہ ذی شعور ہوتے ہوئے بھی ظالم اور جاہل ہے۔

مادہ

یہ سب سے بڑی اور اہم تخلیق ہے۔ کیونکہ اس سے باقی ساری کائنات بنائی گئی ہے۔ اس میں بے شمار اجزاء شامل ہیں۔ سائنسدان ہی بتا سکتے ہیں کہ کتنے اجزاء سے ساری کائنات کو بنایا گیا ہے۔

بہر حال میجر اجزاء چار ہیں۔ آگ، مٹی، ہوا، پانی

مادہ میں ملاوٹ ہے۔ خالص نہیں ہے۔ ملاوٹ ہے تو کثافت ہے اور کثافت ہے تو بھاری پن ہے۔ پاک نہیں ہے۔

پھر مادہ میں کشش ہے مقناطیسیت ہے۔ مادہ اسی کشش کی وجہ سے انسان کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اور مادی ڈور جاری وساری ہے۔ مادے میں چونکہ بہت اجزاء ہیں اس لئے لازمی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان کی خصوصیات بھی علیحدہ علیحدہ ہونگی۔ اور ان کے اثرات بھی اور

جذبات بھی علیحدہ علیحدہ ہونگے۔ مثلاً

لالچ، ہرس، طمع، جھوٹ، فریب، ظلم، نفرت، محبت، صداقت، اچھائی کا جذبہ، اللہ تعالیٰ کی پہچان، بہادری، ڈرپوک ہونا، سوچ اور سمجھ، انہی اجزاء کی کمی بیشی سے یہ جذبات کم یا زیادہ ہوتے رہتے ہیں۔ اجزائے ترکیبی ہی کو کم زیادہ یا آگے پیچھے کرنے سے صورت اشکال بھی تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اور ایک چیز دوسری سے مختلف ہے۔ انسانی اشکال بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور سوچیں بھی۔

مادہ مادے سے جنم لیتا ہے، مادہ مادے کو کھاتا ہے، مادہ سے مادے کی تباہی ہوتی ہے، مادہ مادے پر ظلم کرتا ہے اور مادہ مادے سے محبت کرتا ہے۔

اسکا مطلب یہ نہیں کہ مادے کو کل سمجھتا ہوں۔ مادے کو کس نے پیدا کیا؟ مادے میں یہ ساری خصوصیات کس نے رکھیں؟ مادے کو مختلف اشکال کس نے دیں؟ مادے کو ہر وقت کون حرکت دے رہا ہے؟ مادہ کو کون گورن کر رہا ہے؟ اللہ کی ذات واحد ہے جس کے حکم کے بغیر کوئی پتہ تک نہیں ہل سکتا۔

اب ہم دوسری مخلوقات کا جائزہ لیتے ہیں۔ بہت کم مخلوقات ہیں جن کو ہم جانتے ہیں۔

(1) فرشتے

اللہ تعالیٰ نے انکو نور سے بنایا ہے۔ منبع نور اللہ خود ہے اسکے نور سے بنی ہوئی مخلوق بھی خالص ہوگی۔ جب ملاوٹ نہیں ہے تو گناہ نہیں کر سکتے۔ ہم کہتے ہیں کہ ان میں نفس نہیں ہے میں کہتا ہوں کہ ان میں ملاوٹ نہیں ہے اس لئے وہ گناہ کی طرف نہیں جاتے اپنی اپنی ڈیوٹی میں لگے ہوئے ہیں۔ اور اپنا کام بطریقہ احسن انجام دے رہے ہیں۔

(2) جنات

جنات کو اللہ تعالیٰ نے آگ سے بنایا ہے۔ آگ بہت سی گیسوں کا مجموعہ ہے۔ جب بہت سی گیسیں مل گئی تو ملاوٹ ہوگئی۔ اور پھر اس میں مادہ بھی کارفرما ہے اس لئے ان میں گناہ کی صلاحیت موجود ہے مادہ ہوگا تو ملاوٹ ہوگی، ملاوٹ ہوگی تو کثافت ہوگی، کثافت ہوگی تو گناہ کی صلاحیت ہوگی۔ جب گناہ کی صلاحیت ہوگی تو جزا اور سزا ہوگی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا کہ جنات اور انسان اکٹھے دوزخ میں ہونگے۔

(3) انسان

باقی مخلوقات جزوی طور پر مادہ سے بنی ہیں۔ انسان کو مادہ کے سب عناصر کو اکٹھا کر کے بنایا گیا ہے۔ مثلاً: آگ، مٹی، ہوا اور پانی

اس لئے انسان میں ساری کثافتیں موجود ہیں۔ اور گناہ بھی یہ سب مخلوقات سے زیارہ کرے گا۔ سستی بھی اس میں زیادہ ہوگی اسکی جزا اور سزا بھی زیادہ ہوگی۔

ا۔ ساری کائنات مادہ سے بنی ہے۔

۲۔ ساری کائنات ذی شعور ہے۔

۳۔ ہر ذی شعور جو مادہ سے بنا ہے اسکو حساب دینا ہے۔

۴۔ انجام جنت یا دوزخ ہے۔

جب انسان اور جن دوزخ میں اکٹھے ہونگے تو ان میں مماثلت ہے۔ جب پتھر دوزخ کا ایندھن ہونگے تو مماثلت ہے۔ انسان کو برتری صرف دو باتوں میں ہے۔ جو انسان کو افضل بناتی ہیں۔

(1) ساری کائنات کو کن کہا اور ہو گیا۔ یعنی جس چیز کے بنانے کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کن کہا وہ چیز بن گئی۔ لیکن انسان کے ساتھ ایسے نہیں ہوا۔ انسان کے بت کو اللہ تعالیٰ نے خود بنایا۔ اور روح جو ہے وہ حکم ربی ہے۔ یعنی بت بنانے کے بعد حکم ہوا کن تو انسان بن گیا مکمل ہو گیا۔ باقی ساری باتیں بعد میں ہوئیں۔ مثلاً

الحجر آیت 2,9 میں ارشاد ہوتا ہے "**فاذا سویة و نفخت فیه من روحی فقعوله سجدین** "ترجمہ! پھر جب ٹھیک کروں انسان کو یعنی انسان مکمل ہو جاوے اسکے بعد پھونک دوں اسکو اپنی روح (جان) سے تو گر پڑیو اس کے سجدہ میں۔

اسی طرح کی ایک اور آیت 72,71 سورۃ ص

"اذ قال ربك للملئكة انی خالق بشرٌ من طین ٥فاذ سویة و نفخت فیه من روحی فقعوله سجدین"

ترجمہ! جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو میں بناتا ہوں ایک انسان مٹی کا۔ پھر جب ٹھیک بنا چکوں اور پھونکوں اس میں ایک اپنی جان تو تم گر پڑیو اس کے آگے سجدے میں"

ان دونوں آیتوں کا متن تقریباً ایک ہی ہے لیکن ایک خفیف سا امتزاج ہے وہ یہ کہ روح حکم ربی ہے حکم تو کن ہے اور کن کہنے کے بعد انسان تو مکمل ہو گیا۔ اسکے بعد انسان کو اپنی روح یا جان سے پھونکا گیا۔ یعنی اللہ نے اپنی ذات بحت کا کچھ حصہ جس کو اپنی جان یا روح کہا گیا ہے۔ بطور خاص انسان میں رکھ دیا۔ پھونک دیا۔ اسکے بعد فرشتوں کو حکم ہے سجدہ میں گر پڑنے کا یہی میرے نزدیک امانت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے انسان بڑا ظالم اور احمق ہے پھر یہ اشرف المخلوقات کیسے ہو گیا۔ اسکو دو چیزیں ممتاز کرتی ہیں۔

(۱) ساری کائنات کی ہر چیز کو کہا کن اور بن گئی لیکن انسان کو اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ اپنے ہاتھوں سے بنانے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں جب شیطان کو رد کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے حیران کن لہجہ میں فرمایا کہ میں نے اسکو اپنے ہاتھوں سے بنایا اور تم نے اس کو سجدہ نہیں کیا۔ اندازہ لگائیں کہ یہ کتنی بڑی سعادت ہے۔

(۲) دوسرے اسکو اپنی جان یا روح سے پھونکا اور کسی تخلیق کو یہ سعادت بھی حاصل نہیں ہے۔ ان دو خصوصیات کی وجہ سے انسان سب مخلوقات سے ممتاز ہے اس لحاظ سے ہونا تو یہ چاہیے تھا:۔

ا۔ جتنا مادہ بطور جسم انسان کو الاٹ ہوا تھا یا ہوا ہے اس کو اللہ اور اسکے رسولوں کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق چمکاتا، پالش کرتا، صاف کرتا اور پاک ولطیف کر کے اللہ کے حضور پیش کرتا اور سرخرو ہو جاتا۔ لیکن یہ ظالم اس لئے ہوا کہ اس نے اس امانت کا پاس نہیں کیا اللہ کو اپنے اندر موجود نہیں سمجھا اسکی بطور خاص موجودگی میں یہ سارے برے کام کرتا ہے دوزخ کا مستحق ہے اس لئے اس نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اس لئے ظالم ہے۔

۲۔ اللہ جو کہ بطور خاص اس میں موجود ہے۔ انسان نے اس کا احترام نہیں کیا اللہ کی موجودگی میں برے کام کرتا ہے اس لئے احمق ہے۔

۳۔ اسکو اللہ کے ساتھ محبت اور عشق کرنا چاہیے تھا برائی کی طرف اللہ کی موجودگی میں نہیں جانا چاہیے تھا۔

درس حدیث

اسلام، ایمان اور احسان کی حقیقت

رانا اعجاز احمد

حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ ایک دن ہم رسول اللہؐ کے پاس بیٹھے تھے کہ اچانک ایک آدمی ہمارے سامنے نمودار ہوا جس کے کپڑے انتہائی سفید اور بال انتہائی سیاہ تھے اس پر سفر کا کوئی نشان دکھائی نہ دیتا تھا نہ ہی ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا تھا، یہاں تک کہ وہ نبیؐ کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اپنے گھٹنے رسول اللہؐ کے گھٹنوں کے ساتھ ملا دیئے اور اپنی ہتھیلیاں اپنی رانوں پر رکھ دیں اور کہنے لگا مجھے اسلام کے متعلق بتایئے رسول اللہؐ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تو اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے اور بیت اللہ کا حج کرے۔ اگر تو اس کے سفر کی طاقت رکھتا ہو۔ وہ بولا آپؐ نے سچ فرمایا (حضرت عمرؓ کہتے ہیں) ہمیں تعجب ہوا کہ وہ آپ سے سوال پوچھتا ہے اور تصدیق بھی کرتا ہے پھر وہ بولا مجھے ایمان کے متعلق بتایئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تو اللہ پر، اس کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور آخری دن پر یقین کرے اور اچھی بری تقدیر پر ایمان لائے۔ وہ بولا آپؐ نے سچ کہا۔ اس نے پھر کہا کہ مجھے بتایئے کہ احسان کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تو اللہ کی عبادت ایسے کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے بس اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ اس نے کہا آپؐ نے سچ فرمایا۔ وہ بولا مجھے قیامت کے متعلق بتایئے۔ آپؐ نے فرمایا، جس سے یہ سوال کیا گیا ہے وہ سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔ وہ بولا پھر مجھے اس کی نشانیاں بتایئے آپؐ نے فرمایا کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنے گی اور یہ کہ تو ننگے پاؤں ننگے بدن تنگدست بھیڑ بکریاں چرانے والے لوگوں کو دیکھے گا کہ عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے پر فخر کریں گے پھر وہ شخص چلا گیا تو رسول اللہؐ نے کچھ دیر توقف کیا۔ پھر فرمایا اے عمر! کیا جانتے ہو کہ سوال کرنے والا کون تھا میں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسولؐ اس بات کو زیادہ جانتے ہیں آپؐ نے فرمایا: بیشک وہ جبرئیل تھے جو تمہیں تمہارا

دین سکھانے آئے تھے۔ (اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا)

اسلام، ایمان اور احسان کی حقیقت

حدیث کی ابتداء ہی میں ایک عجیب وغریب شخصیت اور کیفیت والے آدمی کا ذکر ہے۔ اس آدمی کو دیکھ کر حضرت عمرؓ جیسے مدبر صحابی حیرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔ حیرت کی وجہ یہ تھی کہ باہر سے مسجد میں داخل ہونے والے کا لباس بالکل سفید براق تھا یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے مسجد کے قریب کے کسی مکان سے مسجد میں قدم رکھا ہے۔ لیکن دوسرے طرف صحابہ میں سے کوئی بھی اسے پہچانتا نہ تھا۔ یہ بات ظاہر کرتی تھی کہ وہ مدینہ شریف کی طرف دور سے سفر کر کے آیا ہے۔ پھر اس نے اپنے گھٹنے رسول اللہؐ کے گھٹنوں سے ملا دیئے یعنی مودب ہو کر بیٹھ گیا جیسے شاگرد اپنے استاد کے سامنے بیٹھتا ہے اور اس نے اپنے ہاتھ اپنی رانوں پر رکھے دوسری روایت میں یہ وضاحت موجود ہے کہ اس نے اپنے ہاتھ رسول پاکؐ کی رانوں پر رکھے۔

یہ بظاہر انسانی شکل اختیار کئے ہوئے حضرت جبرائیل تھے۔ جیسا کہ آخر میں رسول اللہؐ نے خود واضح کر دیا ہے، صحابہ آنحضورؐ سے سوالات نہیں کرتے تھے۔ بلکہ منتظر رہتے کہ کوئی دیہاتی آئے اور آپ سے کچھ پوچھے جس سے صحابہ بھی فائدہ حاصل کر سکیں۔

اس حدیث کو حدیث جبرائیل کہا گیا ہے۔ یہ حدیث رسول پاک نے ۱۰ ہجری میں الوداعی حج سے قبل ارشاد فرمائی۔ محدثین نے اس کو "ام الاحادیث" اور "ام الجوامع" کے نام دیئے ہیں۔ محدث قرطبی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث "ام السنۃ" کہلانے کی مستحق ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں:۔

یہ حدیث ظاہری اور باطنی سب عبادات کو شامل ہے۔ اس میں جسمانی اعمال باطنی اسرار اور تمام علوم شرعیہ مذکور ہیں (فتح الباری)

ملا علی قاری مکی کہتے ہیں:

اس جلیل القدر حدیث کو حدیث جبرائیل اور ام الاحادیث کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ شریعت، طریقت اور حقیقت تینوں کی جامع ہے۔

اسلام کیا ہے؟

اسلام کا لغوی معنی ہے اپنے آپ کو کسی دوسرے کے سپرد کرنا۔ فرمانبرداری اور خوشی سے کسی کا حکم بجالانا۔ شرعاً اس کا مفہوم وہی ہے جو رسول اکرمؐ نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ یعنی دین کے احکام اور ارکان کو بجالانے کا نام اسلام ہے۔

ان میں سب سے پہلے یہ گواہی دینا ہے اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور حضرت محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔

(۲) نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔ اس تشریح کے اعتبار سے اسلام زبانی اقرار اور جسمانی عمل کا نام ہے۔

فعجبنا له یسئاله ویصدقه: "ہم نے تعجب کیا کہ وہ آپ سے سوال کرتا اور تصدیق بھی کرتا ہے۔" تعجب کی وجہ یہ ہے کہ سوال اسی وقت کیا جاتا ہے جب کسی بات کا علم نہ ہو اور تصدیق اس وقت ہوتی ہے جب پہلے سے کوئی بات علم میں ہو صحابہ حیران ہوئے کہ نو وارد علم رکھنے کے باوجود پوچھ کیوں رہا ہے؟

ایمان کیا ہے؟

لغت میں ایمان تصدیق کو کہتے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں دینی عقائد کو دل سے مان لینے کا نام ایمان ہے۔

حضرت امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ایمان کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ایمان اصطلاح شریعت میں چار معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

۱۔ وہ ظاہری ایمان جس پر دنیاوی احکام کا مدار ہے اور جس کی وجہ سے انسان کی جان اور اس کا مال محفوظ ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی ایمان کے بارے میں رسول پاکؐ نے فرمایا:

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے لڑوں جب تک وہ اس بات کی شہادت نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب انہوں نے ایسا کر لیا تو مجھ سے اپنی جان اور مال بچا لئے مگر یہ کہ اسلام کا کوئی حق

ان پر ہو۔ اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔

۲۔ ایمان کی دوسری قسم وہ ہے جس پر آخرت کی نجات کا انحصار ہے اور اس میں تمام عقائد حقہ، اعمال حسنہ اور اخلاق محمودہ شامل ہیں۔ اور یہی ایمان ہے جو بڑھتا اور کم ہوتا ہے۔ اخلاق و اعمال میں سے کسی ایک پر ایمان کا اطلاق اسی معنی کی بنا پر ہوتا ہے۔ مثلاً آنحضورؐ نے فرمایا:

"جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں۔ جس میں وعدے کی پابندی نہیں اس میں ایمان نہیں"

ایمان کے یہی معنی مراد لیتے ہوئے رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:

"ایمان کی ستر سے کچھ زیادہ شاخیں ہیں اور حیاء بھی ایمان کی ایک شاخ ہے"

ایمان کے اہم اجزا یا شاخیں باہم مساوی نہیں بلکہ ان کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) اہم اجزاء جن کو ارکان اسلام کہا جاتا ہے۔ زیر مطالعہ حدیث میں انہی کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہ ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان

۲۔ فرشتوں پر ایمان

۳۔ اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں پر ایمان

۴۔ اللہ کے رسولوں پر ایمان

۵۔ آخرت کے دن پر ایمان

۶۔ اچھی اور بری تقدیر پر ایمان

(۲) دوسرے اجزاء کا درجہ مندرجہ بالا اجزاء کے برابر نہیں جن کو رسول اللہؐ نے ستر سے کچھ اوپر بیان فرمایا ہے۔

(۳) ایمان کا تیسرا معنی وہ سکون واطمینان اور لذت وسرور ہے جو مقربین اور خواص کا حصہ ہے قرآن میں ارشاد ہے۔

"وھو الذی انزل السکینۃ فی قلوب المومنین لیزدادوا

ایماناً مع ایمانہم"

"اور اسی نے مومنوں کے دلوں میں سکون نازل فرمایا تا کہ ایمان میں مزید اضافے کا باعث ہو۔"

رسول اکرمؐ نے جوفرمایا: **لایزنی الزانی حین یزنی و ھو مومنین۔** " کہ جب زانی زنا کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا" اس کا یہ مطلب ہے کہ یقین اور سکون ایمانی سے محروم ہوتا ہے۔

(۴) ایمان کے چوتھے معنی ہیں تصدیق قلبی کے، اس میں تمام ضروری عناصر مثلاً ایمان بالرسل، ایمان بالکتب سب شامل ہیں۔

اگر ایمان کے بارے وارد شدہ احادیث و آیات کو انہی چار معنوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو کسی شبہ اور غلطی کا امکان باقی نہیں رہتا۔

احسان کیا ہے

رسول اللہؐ نے اس کی وضاحت میں یوں فرمایا۔ "اللہ کی عبادت اسطرح کرو کہ گویا خدا کو دیکھ رہے ہو۔" یہ استغراق اور مشاہدہ کا مقام ہے۔ یہ وہ آخری درجہ ہے جو کسی عبادت گزار کو نصیب ہوسکتا ہے۔

اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو کم از کم عبادت کرتے وقت یہ خیال ضرور پیش نظر رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا خیال دل میں جاگزیں ہو تو بھی عبادت میں خضوع و خشوع، اللہ کے ڈر اور احتیاط کی کیفیت موجود رہے گی۔ جس طرح کوئی غلام بادشاہ کے حضور مودب کھڑا ہوتا ہے۔ اور اس سے جو لذت اور یکسوئی نصیب ہوگی وہی عبادت کا حسن اور خوبصورتی ہے اسی کو احسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قیامت اور علامات قیامت

جب سائل نے آنحضرتؐ سے یہ پوچھا کہ قیامت کے متعلق بتایئے تو آپ نے فرمایا کہ "جس سے سوال کیا گیا ہے وہ سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔"

CamScanner

اس پر سائل نے آخری سوال کیا، پھر مجھے علامات قیامت کے متعلق بتایئے۔ جناب رسالتمآبؐ نے جواب میں فرمایا:۔

ان تلد الامته ربتھا یعنی لونڈی اپنی مالکہ کو جنے گی۔

محدثین نے اس سے ایک تو مراد یہ لی ہے کہ عورتیں ایسی لڑکیاں جنیں گی جو اپنی ماؤں پر سرداری کریں گی۔ یعنی ایسی اولاد پیدا ہونے لگے گی جن کے اخلاق بہت گرے ہوئے ہوں اور جو تہذیب سے بہت دور ہوں اور اپنے ماں باپ پر حکم چلائیں اور ان کو غلاموں کی طرح حکم دے کر کام کرائیں جیسا کہ آج کل عام مشاہدے میں آرہا ہے۔ یہاں لڑکی کا بطور مثال ذکر فرمایا گیا ہے کیونکہ لڑکی کی سرشت میں فرمانبرداری لڑکے کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ جب لڑکیوں کا معاملہ ایسا ہو جائے تو لڑکوں کا تو کہنا ہی کیا۔

قیامت کی دوسری نشانی آنحضورؐ نے یہ فرمائی کہ ننگے پیر پھرنے والے اور ننگے بدن رہنے والے تنگدست اور بھیڑ بکریاں چرانے والے اونچے اونچے مکانات اور عمارتیں بنا کر آپس میں فخر کریں گے اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں ہونگے۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔

ایک یہ کہ ایسے انقلاب رونما ہونگے کہ ایسے تنگدست لوگ جن کے پاس تن ڈھانپنے کو نہ کپڑا ہو اور نہ پیر میں ڈالنے کے لئے جوتا اور جو بھیڑ بکریاں چرا کر گزارہ کرتے ہوں ان کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہو جائے گی اور اپنی کم فہمی کی وجہ سے ان کے نزدیک اس مال کا مصرف بس اس سے زیادہ نہ ہوگا کہ اسے مٹی اور گارے میں لگا لگا کر مکانوں کی بلندیوں پر فخر کریں۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اتنے مفلس وقلاش ہونے کے باوجود بلند و بالا عمارات بنائیں گے اور اس پر آپس میں فخر کریں گے۔

معاملات اور اخلاق و آداب

خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ

انسان صبح سے شام اور شام سے صبح تک کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ اس کے یہ تمام افعال تین حصوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں:

ا۔ وہ فعل جن میں اس کا واسطہ صرف خدا سے ہوتا ہے۔ یہ حقوق اللہ کہلاتے ہیں۔

۲۔ وہ فعل جو صرف اس کی اپنی ذات تک محدود ہوتے ہیں ان کو حقوق ذاتی یا حقوق نفسی کہتے ہیں۔

۳۔ وہ فعل جو اس کی ذات اور مخلوق کے کسی دوسرے فرد یا افراد سے متعلق ہوتے ہیں۔ ان کو معاملات کہا جاتا ہے۔ ان حقوق کو انسان جس طریقے اور نہج سے ادا کرتا ہے اس کا نام اخلاق ہے۔ مثلاً اگر کوئی آدمی اپنے کسی حق کو نرمی خوش اسلوبی اور بخوشی خاطر ادا کردے تو یہ اخلاق حسنہ یا خوش خلقی کہلائے گا۔ اور اس آدمی کو خوش خلق کہیں گے لیکن اگر کوئی آدمی اپنے حقوق ادا تو کرے لیکن سختی و درشتی، بدسلوکی، کراہت یا لیت ولعل سے ادا کرے تو اس طریقہ کو بداخلاقی اور ایسے آدمی کو بداخلاق کہا جائے گا۔

ہر قوم اور مذہب میں ان حقوق سہ گانہ کو بجا لانے کا ایک دستور ہوتا ہے۔ جس قوم کی اکثریت اپنے دستور پر جس قدر ہم آہنگی، یکسانیت اور سرگرمی سے عمل کرتی ہے اسی قدر وہ قوم آرام و آسائش اور راحت و عزت سے زندگی گزار سکتی ہے۔ ہر قوم کی طاقت و قوت اس دستور کی ساخت پر بھی منحصر ہوتی ہے۔ یعنی جس قدر یہ دستور کسی قوم کے مقتضیات ذہنی و جسمانی کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی قدر وہ قوم طاقتور اور خوش حال ہوتی ہے۔ ملت اسلامیہ کا دستور قرآن ہے جو الہامی کتاب ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کی فطرت و طبیعت اور مقتضیات کو جس قدر انسان کا بنانے والا سمجھ سکتا ہے خود انسان بھی ہرگز نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمارا یہ دستور دنیا کا سب سے مکمل اور بے نقص دستور ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ یہ دنیا کا آخری اور مکمل ترین دستور ہے۔ جو لوگ اس دستور کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں اگر وہ اس پر پوری طرح عمل کریں تو ناممکن ہے کہ انفراداً یا اجتماعاً کسی لحاظ سے بھی گھاٹے میں رہیں۔ ہمارے زوال کی پہلی اور بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم اس دستور پر پوری ہم آہنگی اور سرگرمی سے عمل نہیں کرتے۔ اس دستور میں حقوق اللہ حقوق نفسی اور حقوق العباد سب بتا دیئے گئے ہیں۔ اگر ہمارے تمام فرقے ان اصولوں پر سختی سے کاربند ہو جائیں اور فروعات یا اپنے خود ساختہ غلط اصولوں کے لئے ایک دوسرے کا سر نہ

پھوڑیں اور دنیا کے قلیل نفع کی خاطر دین اور قوم کو دشمنوں کے ہاتھ نہ بیچیں جیسا کہ ہو رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمیں وہی طاقت و عظمت پھر حاصل نہ ہو جائے۔ جو قرن اول میں حاصل تھی۔

اب ہم متذکرہ صدر حقوق سہ گانہ کا بیان کرتے ہیں۔

حقوق اللہ

اگر تم مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہو تو تم کو اس بات پر یقین محکم ہونا چاہیے کہ تم کو اللہ نے پیدا کیا ہے۔ وہی تم کو رزق دیتا ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے، تمھاری بہتری اور بہبودی کے لئے کرتا ہے۔ وہی تم کو مارے گا اور تمھاری موت کے بعد وہ مختار ہے کہ تمھیں سزا دے یا بخش دے اگر تم کو یہ یقین محکم حاصل ہے تو تم پر فرض ہے کہ اللہ کی محبت، اطاعت، شکر اور خوف ورجا کے جذبات سے ہر وقت اپنے دل کو معمور رکھو۔ نعمتوں اور راحتوں کے لئے اس کا شکر بجالاؤ اور مصائب و تکالیف کے وقت اسی کی طرف رجوع کرو۔ اور اسی کی عبادت کرو یعنی وہ تمام احکام بجالاؤ جو قرآن میں موجود ہیں۔ چونکہ اس کا بیان پہلے مفصل کیا جاچکا ہے۔ اس لئے اب حقوق نفسی بیان کئے جاتے ہیں۔

حقوق نفسی

اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ میں حکم دیا ہے کہ اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ یعنی اس کی حفاظت کرو۔ اور سورۃ مائدہ میں ارشاد فرمایا ہے "اے ایمان والو! تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے۔" رسول اللہؐ فرماتے ہیں۔ **ولنفسك عليك حق** یعنی تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کو سب سے پہلے اپنے نفس اور بقاء اور درستی کی کوشش کرنی چاہیے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد بھی اس کے بعد ہیں ظاہر ہے کہ اگر آدمی کا نفس ہی ہلاک ہو جائے۔ یعنی آدمی مر جائے تو وہ نہ حقوق اللہ ادا کر سکتا ہے نہ حقوق العباد۔ اسی طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ آدمی جتنا بیمار، کمزور، کم عقل، کم علم اور ناتجربہ کار ہوگا اتنا ہی اللہ اور مخلوق کے متعلق اپنے فرائض اچھی طرح انجام دینے میں قاصر رہے گا۔ اس لئے انسان کو چاہیے کہ اس کی اپنی ذات کے متعلق جو حقوق و فرائض اس پر عاید ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے ان کو پوری طرح انجام دے وہ فرائض یہ ہیں۔

۱۔ صحت ۲۔ علم و تجربہ ۳۔ عزت نفسی ۴۔ خود اعتمادی ۵۔ عمل

اب ہر ایک کا بیان الگ الگ کیا جاتا ہے۔

ا۔ صحت

قیام صحت کے لئے یہ باتیں ضروری ہیں:-

۱۔ طہارت: جسم کی، لباس کی اور خیالات کی۔ جسم اور لباس کی طہارت کا بیان پیچھے کیا جا چکا ہے۔ خیالات کی پاکیزگی، ایمان کامل، صحیح قسم کی نماز اور اللہ کے خوف سے پیدا ہوتی ہے اس کا بیان بھی کیا جا چکا ہے۔

۲۔ غذا: غذا ایسی کھانی چاہیے جو زود ہضم اور زیادہ خون پیدا کرنے والی ہو۔ کھانا اس وقت کھانا چاہیے، جب خوب بھوک لگے اور دو نوالے کی اشتہا باقی رہ جائے تو ہاتھ روک لینا چاہیے۔ غذا آہستہ آہستہ اور خوب چبا کر کھائی جائے۔ کھاتے وقت طبیعت خوب خوش اور بشاش ہونی چاہیے۔ تفکر اور غصہ کی حالت میں کھایا ہوا کھانا اچھی طرح جز و بدن نہیں ہوتا۔ گوشت جہاں تک ہو کم کھایا جائے۔ کیونکہ اس سے غصہ اور بہمیت زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے گوشت کو جائز قرار دیا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دونوں وقت بغیر گوشت کے لقمہ ہی نہ ٹوٹے۔ گوشت دماغ میں گرمی پیدا کرتا ہے حالانکہ دنیا میں کامیابی کے لئے ٹھنڈے مزاج کی اشد ضرورت ہے۔

۳۔ لباس: سادہ پائیدار اور کم قیمت پہننا چاہیے۔ قیمتی اور بھڑکیلے لباس سے غرور و نخوت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ لباس پاک، صاف ستھرا اور وضع قطع کے لحاظ سے دیدہ زیب اور حدود شرعی کے اندر قومی فیشن کے مطابق ہو۔ لباس گرمی، سردی وغیرہ کے لحاظ سے موسم کے مطابق آرام دہ ہونا چاہیے۔ زیادہ قیمتی لباس سے زندگی کے اور اخراجات بھی بہت بڑھ جاتے ہیں۔

۴۔ مکان: مکان پکا ہو یا کچا، محل ہو یا جھونپڑی، آئینہ کی طرح صاف ستھرا ہونا چاہیے۔ گندے مکان کا اثر مکینوں کے مزاج اور ذہن پر ہمیشہ برا ہوتا ہے۔

۵۔ پابندی اوقات: اس کا صحت پر بہت ہی اچھا اثر ہوتا ہے۔ کیونکہ زندگی با قاعدہ گزرتی ہے۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں کو اس طرح بانٹا جائے کہ کام عبادت اور تفریحات سب کے لئے مناسب وقت مل جائے قیام صحت اور پابندی اوقات کے لئے سب سے پہلی اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ رات کو انسان جلد از جلد سو جائے اور صبح سورج نکلنے سے کم از کم ایک گھنٹہ قبل ضرور ہی اٹھ بیٹھے۔ رات کو زیادہ دیر تک جاگنا، زیادہ پڑھنا اور زیادہ دیر تک کھیلنا صحت کے لئے سم قاتل سے کم نہیں۔ صبح سویرے اٹھنے کے فوائد کون نہیں جانتا۔

۶۔ غسل: غسل روزانہ کرنا چاہیے، پانی موسم کے لحاظ سے اپنی مرضی کے مطابق گرم یا

سرد ہونا چاہیے۔

۷۔ عبادت: صحت کے قیام کے لئے عبادت بھی بہت ضروری ہے۔اس سے دماغ کو سکون اور دل کو طاقت اور راحت حاصل ہوتی ہے۔اور تفکرات کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔

۸۔ ورزش اور کھیل کود: یہ بھی بہت ضروری اور اہم ہیں خواہ دیسی ہوں یا مغربی قسم کے۔ورزش کا بہترین وقت قبل از طلوع آفتاب اور کھیلوں کا بہترین وقت عصر اور مغرب کے درمیان ہے، جو لوگ ورزش نہ کر سکیں ان کو صبح سورج نکلنے سے پہلے اور شام کو مغرب کے بعد یا ذرا پہلے اس قدر چہل قدمی کرنا چاہیے کہ کسی قدر تھکان ہو جائے۔

۹۔ کام: کام اتنا کیا جائے کا تھکان ہو جائے۔دماغی اور تحریری کام کرنے والوں کو کھانا کھانے کے کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ بعد کام شروع کرنا چاہیے۔ایسے لوگوں کو صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ہلکا اور کسی قدر کم کھانا چاہیے۔کام میں لگے رہنے سے صرف صحت ہی اچھی نہیں رہتی بلکہ رنج وغم اور تفکرات بھی پاس نہیں پھٹکنے پاتے۔

۱۰۔ تفریح: کام ختم کرنے اور رات کا کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر تفریح کرنا بھی ضروری ہے۔بہترین تفریح یہ ہے کہ دوستوں یا اپنے بال بچوں میں بیٹھ کر خوب ہنسی، دل لگی اور مذاق کی باتیں کی جائیں۔خوب ہنسو اور ہنساؤ۔

جب کھانا تحلیل ہو جائے تو عشاء کی نماز پڑھتے ہی سو جاؤ۔یہ ہیں وہ باتیں جو صحت کے لئے ضروری ہیں۔لیکن ایک مسلمان کے لئے صرف صحت کا تحفظ ہی کافی نہیں بلکہ ہر مسلمان کو اتنی جسمانی طاقت بھی پیدا کرنی چاہیے کہ وہ بیک وقت کم از کم دو کافر دشمنوں کا مقابلہ کر سکے۔اسلام کی عزت اور اپنے ناموس کی حفاظت کے لئے یہ چیز آج کل بہت ہی ضروری ہے۔

۲۔علم و تجربہ

زندگی آرام وعزت سے گزارنے کے لئے علم و تجربہ حاصل کرنے کی اشد ضرورت ہے اس سے عقل بڑھتی ہے،کسب معاش میں سہولت ہوتی ہے اور دنیا میں عزت ملتی ہے۔علم ایسا حاصل کرنا چاہیے جس سے دین اور دنیا دونوں کی سمجھ پیدا ہو اور قوم کی انفرادی اور اجتماعی ترقی میں مدد ملے۔تجربہ حاصل کرنے کے لئے مختلف قسم کی صحبتوں میں بیٹھنا اور لوگوں کے افعال واقوال اور حرکات وسکنات کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔سفر سے تجربہ حاصل کرنے میں بے انتہا مدد ملتی ہے۔ ممکن ہو تو ہر سال میں ایک مرتبہ ضرور ہی کہیں کا لمبا سفر کیا جائے ورنہ مہینے میں ایک مرتبہ دو ایک دن کے لئے تفریحاً آس پاس کے شہروں، جنگلوں اور دیہات میں جانے کا تو کوئی ضرور ہی

بندوبست کرنا چاہیے۔ اچھے مصنفوں کی کتابیں علم و تجربہ دونوں کو بڑھانے میں قابل قدر مدد دیتی ہیں۔

۳۔ عزت نفسی

شرافت اور نیکی پر قائم رہنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان خود اپنی نظر میں عزت والا ہو۔ جو شخص خود اپنی نظر میں ذلیل ہوگا، دوسروں کی نظر میں ہرگز معزز نہیں ہوسکتا۔ اگر دھوکہ یا غلطی سے کچھ لوگ اس کی عزت کریں بھی تو آخر میں قلعی کھل جائے گی۔ اپنی نظر میں انسان کی عزت اسی حالت میں قائم رہ سکتی ہے۔ جب وہ نیک ہو۔ عزت نفسی قائم رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تنہائی میں بھی انسان کے خیالات پاکیزہ رہیں اور کسی برے کام کا خیال بھی آئے تو وہ شرمندہ ہو جائے۔ لیکن یہ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب وہ اللہ کو حاضر و ناظر محسوس کرتا ہو اور یہ بات جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ایمان کامل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

۴۔ خود اعتمادی

دنیا میں کامیاب زندگی گزارنے کے لئے بڑی شرط یہ ہے کہ انسان کو خود اپنے اوپر اعتماد ہو۔ اعتماد اس بات پر کہ میں اس کام کو واقعی پوری قابلیت سے انجام دے سکتا ہوں۔ اعتماد اس بات پر کہ میں ایسی کوئی حرکت قبیح اور ناشائستہ نہیں کرسکتا جس سے اللہ کی حکم عدولی ہو۔ اعتماد اس بات پر کہ میں شریف ہوں مسلمان ہوں اور مومن ہوں۔

۵۔ عمل

دنیا اور دین میں کامیابی کے لئے عمل بھی ضروری چیز ہے عمل کے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ انسان کتنا ہی عقلمند ہو عالم اور فاضل ہو جب تک عمل نہ کرے گا پتھر کی طرح اپنی جگہ سے آگے نہ بڑھ سکے گا۔ اس لئے علم و تجربہ حاصل کرنے کے بعد اپنا ایک نصب العین مقرر کرلینا چاہیے کہ میں زندگی میں فلاں شے یا فلاں مرتبہ حاصل کر کے رہوں گا۔ پھر اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے ایک دستور العمل بنانا چاہیے۔ پھر خوب کوشش کرنی چاہیے کہ وہ نصب العین حاصل ہو جائے۔ نصب العین اپنے ذرائع کی ممکن حدود کے مطابق ہونا چاہیے ایسا نصب العین ہرگز مقرر نہ کرنا چاہیے جس کا حصول ممکن ہی نہ ہو، ہاں جب ایک نصب العین حاصل ہو جائے تو البتہ دوسرا اور پہلے سے اعلیٰ نصب العین متعین کر کے اس کے حصول کی کوشش شروع کی جاسکتی ہے۔ یہاں تک کہ عمر تمام ہو جائے۔ مطلب یہ کہ خالی اور بیکار پڑے رہنا کسی طرح بھی شریف انسان کے شایان شان نہیں جانور بھی بیکار نہیں رہتے۔ اپنی اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔

حروف مقطعات

قرآن کی بعض سورتوں کے آغاز میں پراسرار حروف لکھے ہوتے ہیں جنہیں ہم حروفِ مقطعات کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان کے بظاہر کوئی معنی نہیں ہیں اور انہیں علیحدہ علیحدہ حروف کی صورت ہی میں پڑھا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن کی دوسری سورت البقرہ کا آغاز **آلٓمٓ** سے ہوتا ہے جسے اَلِف، لام، میم پڑھا جاتا ہے ان حروف کی تشریح نہ تو حدیث میں آئی ہے اور نہ ہی کسی مفسر نے بیان کی ہے۔ اللہ کے فضل سے 1975ء میں ایک مصری محقق راشد خلیفہ نے علم الحساب کی بنیاد پر حروف مقطعات کا جو حل پیش کیا اُس نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا اور بڑے وسیع پیمانے پر اس کی پذیرائی ہوئی۔ ان کے پیش کردہ منطقی دلائل اور مربوط حسابی نظام میں کافی وزن موجود ہے اس لئے ان حقائق کو قرآن کے منزل من اللہ ہونے کے ثبوت میں پیش کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرنی چاہیے۔

اگرچہ علماء کرام کو اِس تحقیق سے اختلاف کرنے کا حق بھی حاصل رہے گا۔ اس تحقیق میں اُنتیس کا ہندسہ مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک عالم نے یہ بھی فرمایا کہ انیس کا ہندسہ تو یہودیوں کے ہاں بڑا مقدس سمجھا جاتا ہے اور ان کی ہر عبادت گاہ میں نمایاں طور پر لکھا ہوا ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو یہ حسن اتفاق۔ انہیں قرآن کی صداقت پر ایمان لانے کے لئے باعث ترغیب بن سکتا ہے۔ مصری محقق کی تحقیق کے مطابق بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O کے حروف کی تعداد انیس (19) کی خدائی کلید کی مدد سے حروف مقطعات کے اسرار کھلتے چلے جاتے ہیں اور ایک ناقابل تردید شہادت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ قرآن کریم کا ایک ایک حرف ایک ایسے پیچیدہ اور مربوط نظام کے تحت رقم کیا گیا ہے جو انسانی دانش کے بس میں نہیں ہے اور عالمگیر آئین کی حامل اِس کتاب ہدایت میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی یا تبدیلی نہیں ہوئی اور نہ ہی ہو سکے گی۔ اللہ تعالیٰ نے چودہ سو برس قبل اس کتاب کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا تھا اس کی حقیقت آنکھوں سے ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ اب ہم جناب خلیفہ راشد کی تحقیق عام فہم الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

الہامی عددی کلید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O جس سے قرآن مجید کی سورۃ الفاتحہ کی ابتدا ہوتی ہے ایک ایسی عظیم آیت ہے جس میں ہمارے رب کا برکتوں سے بھرپور ذاتی اسم اللہ آیا ہے اور ساتھ ہی ظاہری اور

باطنی، دنیوی اور اُخروی، عام اور خاص رحمتوں اور نعمتوں کی بارش برساتے ہوئے دو صفاتی نام الرحمٰن اور الرحیم بھی آئے ہیں۔ نیکی اور بھلائی کے ہر کام کی ابتدا اس مبارک آیت سے کی جاتی ہے اور اس کے توسل سے اللہ کی نصرت اور رحمت طلب کی جاتی ہے۔ حروفِ مقطعات کے سربستہ راز کی مفتاح یعنی کنجی بننے کی سعادت بھی اللہ نے سورۃ الفاتحہ کی سب سے پہلی آیت کو عطا فرمائی۔

حروف مقطعات کی تشریح سے ایک حیرت انگیز اور پیچیدہ نظام آپ کے سامنے آئے گا۔ اس کی تفصیل جاننے سے پہلے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے حروف کی تعداد آپ خود گنیئے۔ آپ حروف کی تعداد اُنیس (19) پائیں گے۔ اُنیس کا یہ عدد حروفِ مقطعات کے راز یعنی قرآنی کوڈ (CODE) کو کھولنے والی چابی ہے۔ اسے آپ ''الہامی عددی کلید'' بھی کہہ سکتے ہیں جس سے حروف مقطعات کے اسرار کھلتے چلے جائیں گے۔ اس سلسلے کا اولین انکشاف یہ ہے کہ جن سورتوں کی ابتدا میں حروف مقطعات آئے ہیں ان کے ان حروف کی تعداد اللہ تعالیٰ نے اس طرح رکھی ہے کہ وہ انیس (19) پر پوری پوری تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس نظام کی تفصیل دکھانے سے پیشتر ہم اس بابرکت آیت یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے اپنے الفاظ کو 19 کی الہامی عددی کلید کے ذریعے جانچتے ہیں۔

(1) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ پورے قرآن میں 114 مرتبہ آئی ہے اور یہ تعداد 19 پر تقسیم ہو جاتی ہے۔ (6x19=114) یہ آیت مبارکہ سورۃ توبہ کے علاوہ قرآن کی ہر سورت کے شروع میں آئی ہے۔ چونکہ قرآن کی سورتوں کی تعداد 114 ہے اس طرح پس آیت کی تعداد 113 بنی چاہیے تھے جو کہ 19 پر تقسیم نہ ہو سکتی۔ سورۃ توبہ والی کمی کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ النمل کی آیت نمبر 30 کے ذریعے پورا فرما دیا جہاں حضرت سلیمان علیہ السلام کے ملکہ سبا کو خط لکھنے کا ذکر ہے اور قرآن کے متن میں یہ تحریر ہے اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اس طرح یہ تعداد 114 ہوگی۔

(2) اس آیت مبارکہ میں چار الفاظ اسم، اللہ، الرحمٰن اور الرحیم آئے ہیں اب ہم یہ دیکھیں گے کہ یہ الفاظ پورے قرآن کریم میں کتنی کتنی مرتبہ آئے ہیں ان کی تعداد کا انیس کے عدد کے ساتھ کیا تعلق ہے۔

CS CamScanner

(جدول نمبر 1) پورے قرآن میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے الفاظ کی تعداد

الفاظ	پورے قرآن میں تعداد	19 سے نسبت
اسم	19	1x19
اللہ	2698	142x19
الرحمٰن	57	3x19
الرحیم	114	6x19

قرآن کریم میں 19 کا ذکر

انیس کا عدد چند خصوصیات کا حامل ہے۔ یہ عدد طاق ہے اور نا قابل تقسیم ہے یعنی کسی دوسرے ہندسے پر اسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا اس عدد سب سے پہلا ہندسہ ایک (1) اور سب سے آخری ہندسہ نو (9) دونوں موجود ہیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ وحی الٰہی میں اس ہندسہ کی کیا اہمیت ہے۔ غار حرا میں جب نزول قرآن کی ابتدا ہوئی تو سب سے پہلی وحی سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات اتاری گئیں اس لئے سورۃ العلق کی خصوصیات کے بارے میں جان لینا بھی مفید رہے گا۔

1۔ قرآن پاک میں اس صورت کا نمبر شمار 96 ہے۔ قرآن کی آخری سورت الناس سے اگر گنتی کرتے ہوئے پیچھے آئیں تو یہ انیسویں سورت ہے۔

2۔ اس سورت کی سب سے پہلی آیت **اِقْرَاء باسم ربك الذى خلق ○** کے حروف کی تعداد بھی اُنیس ہے۔ پہلی وحی پانچ آیات پر مشتمل تھی جن کے الفاظ بھی انیس ہیں۔

3۔ اس سورت کی آیات کی تعداد بھی اُنیس ہے۔

دوسری مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام سورت القلم کی چند آیات اور تیسری مرتبہ سورت المزمل کی ابتدائی آیات لے کر آئے۔ چوتھی مرتبہ آنے والی وحی سورت المدثر کی پہلی تیس آیات پر مشتمل تھی۔ سورت کے شروع ہی میں اس انسان کا ذکر ہے جسے اللہ نے مال اور اولاد کی نعمتوں سے نوازا لیکن اس نے احسان شناسی کی بجائے کفر کی راہ اختیار کی اور اللہ کی آیات سے انکار کرتے ہوئے انہیں جادو کا نام دیا اور اپنی حقیر عقل کے اندازوں سے قرآن کو انسان کا کلام قرار دیا۔

چنانچہ آیات 25 تا 18 میں ارشاد ہوا:۔

CamScanner

انہ فکر و قدر O فقتل کیف قدرہ O ثم قتل کیف قدر O ثم نظرہ ثم عبس و بسر O ثم ادبر واستکبر O فقال ان ھذا الا سحر یوثر O ان ھذا الا قول البشر O

''اس نے فکر کیا اور دل میں ٹھہرایا۔ یہ مارا جائے اس نے کیسا ٹھہرایا۔ پھر یہ مارا جائے اس نے کیسا ٹھہرایا۔ پھر تامل کیا۔ پھر تیوری چڑھائی اور منہ بگاڑ لیا۔ پھر پیٹھ پھیر کر چلا اور غرور کیا۔ پھر بولا یہ تو جادو ہے جو اگلوں سے چلا آتا ہے۔ یہ کچھ نہیں مگر بشر کا قول ہے''

اگلی پانچ آیات یعنی 26 تا 30 میں اللہ تعالیٰ نے ایسے بدبخت انسان کے انجام سے آگاہ فرمایا ہے۔ ''ہم عنقریب اس کو سقر میں داخل کریں گے۔ اور تم کیا سمجھتے ہو کہ سقر کیا ہے۔ نہ باقی رکھے گی اور نہ چھوڑے گی۔ بدن کو جھلسا کر سیاہ کر دے گی۔ اُس پر مقرر ہیں اُنیس (19)''

(علیھا تسعة عشرہ)

گویا چوتھی وحی کا آخری لفظ انیس تھا۔ اللہ علیم وخبیر نے ''19'' کے ہندسے کا ذکر کرنے کے بعد جو اگلی آیت نازل فرمائی وہ 19 حروف پر مشتمل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہی تھی جو کہ سورۃ الفاتحہ کے شروع میں دی گئی تھی اور یہ پہلی مکمل سورت تھی جو ایک ہی وحی میں نازل ہوئی۔ وحی کے نزول کی اس ترتیب سے یہ دلیل مزید وزنی معلوم ہوتی ہے کہ سورۃ مدثر میں آنے والے 19 کے عدد اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے 19 حروف کے درمیان ایک خفیہ تعلق موجود ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہم سورۃ مدثر کی اگلی آیت جو کہ اس سورۃ کی زیادہ تر تین تین اور چار چار الفاظ پر مشتمل چھوٹی چھوٹی آیات کے بیچ میں 57 الفاظ پر مشتمل نمایاں طور پر طویل ترین آیت کا غور سے مطالعہ کریں تو 19 کے ہندسے کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔

وما جعلنا اصحب النار الا ملئکة وما جعلنا عدتھم الا فتنة للذین کفروا لیستیقن الذین اوتو الکتب ویزداد الذین امنوا ایمانا ولا یرتاب الذین اوتو الکتب والمنون ولیقول الذین فی قلوبھم مرض والکفرون ماذا اللہ بھذا مثلا کذلک یضل اللہ من یشاء ویھدی من یشاء وما یعلم جنود ربك الا ھو وما ھی الا ذکری للبشر O (المدثر۔31)

ترجمہ! ہم نے دوزخ کے داروغہ فرشتے ہی بنائے ہیں اور نہیں بنائی ہم نے تعداد اُن کی مگر اس لئے کہ یہ عدد (19):۔

1۔ کفار کے لئے آزمائش بن جائے

2۔ اس لئے کہ اہل کتاب یقین کرلیں۔

3۔ اور مومنوں کا ایمان اور زیادہ ہو جائے۔

4۔ اور اہل کتاب اور مؤمنین کوئی دھوکہ نہ کھائیں

5۔ اور اس لئے کہ جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے اور وہ جو کافر ہیں کہہ اٹھیں کہ اس مثال کے بیان کرنے سے اللہ کا مقصد کیا ہے۔ یوں اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔ اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور یہ تو بشر کے لئے سامان نصیحت ہے"

اس آیت کریمہ کے شروع میں جہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے دوزخ کے داروغے فرشتے ہی مقرر کئے ہیں وہاں آخری حصہ میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کے لشکروں کی تعداد کو تو اُس کے سوا کوئی جانتا ہی نہیں اور اُنیس کی جو گنتی ہم نے بیان کی ہے اس کے چند خصوصی مقاصد ہیں جو یہ ہیں:۔

(الف) جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی اس بے مثل کتاب کو اپنی کج فہمی کے باعث بشر کا کلام کہتے ہیں ان کے لئے یہ عدد ایک امتحان اور آزمائش بن جائے اور اس عدد سے منسلک نظام انہیں ہلا کر رکھ دے۔

(ب) اہل کتاب کو جن کے ضمیر تو قرآن کریم کی صداقت کے قائل ہیں قطعی یقین آجائے کہ ان کی اپنی کتابوں کی تصدیق کرنے والی اور گذشتہ تمام انبیاء کے ٹھیک ٹھیک حالات بیان کرنے والی کتاب یقیناً منزل من اللہ ہے۔

(ج) اہل ایمان جو اللہ کی توفیق سے اس کے آخری رسول ﷺ اور ان پر نازل کی گئی اس کی آخری کتاب پر ایمان رکھتے ہیں ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہو۔

(د) اہل ایمان اور اہل کتاب کے دلوں میں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے اور کوئی شیطانی وسوسہ اور لایعنی انہیں دھوکہ نہ دے سکے۔

(د) منافقین اور کفار اس حقیقت کے خلاف بے اصل دلیلیں اور فضول قسم کے اعتراضات لانے کی وجہ سے صاف ظاہر ہو جائیں۔

(ذ) اس امر کے اظہار سے اللہ جنہیں چاہے گا گمراہ کر دے گا اور جنہیں چاہے گا ہدایت دے گا۔

(ر) اللہ کے فرشتوں کے لشکروں کی تعداد اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا لیکن انیس کی تعداد جو بیان کی گئی ہے یہ تو لوگوں کے لئے نصیحت کا سامان ہے تا کہ اسے بشر کا کلام کہنے والا بشر یہ جان لے کہ ایسی کتاب لکھنا بشر کے بس میں نہیں ہے۔

یہ بات تو اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ سورت مدثر میں اُنیس کا بیان ان لوگوں کے ضمن میں آیا ہے جو قرآن کو انسان کی تخلیق سمجھتے ہیں۔ آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے 19 حروف حیرت انگیز طریقے سے مندرجہ بالا تمام مقاصد پورے کر کے نا قابل تردید شہادت پیش کرتے ہیں کہ یہ کلام کسی بشر کا ہو ہی نہیں سکتا۔

شیطانی وسوسہ سے پناہ مانگئیے

انسان جب بھی اللہ کی راہ پر چلنا اور اس کی ہدایت یعنی قرآن کی طرف رجوع کرنے لگتا ہے تو شیطان فوراً اس کی راہ میں حائل ہونے کے لئے وسوسہ ڈالنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی لئے قرآن کی تلاوت کے وقت اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر حکم فرمایا ہے۔ **فاذا قرات القران فاستعذ بالله من الشیطن الرجیم** O (النحل۔98) جب بھی آپ قرآن پڑھنے لگیں تو شیطان مردود کے خلاف اللہ کی پناہ پکڑا کریں''

کیونکہ اب ہم قرآن کی صداقت اور منزل من اللہ ہونے کے ثبوت میں 19 کے ہندسہ اور قرآن میں لکھے گئے حروف کی تعداد کے درمیان واقع ہونے والے معجزاتی تعلق کا بیان کرنے لگے ہیں اس لئے یہ یقینی بات ہے کہ شیطان اپنے کام سے ہرگز غفلت نہیں برتے گا اور قارئین کے دل میں یہ خیال ضرور پھونکے گا کہ ہوسکتا ہے الفاظ اور حروف کی جو تعداد تحریر کی جا رہی ہے درست نہ ہو۔ اس لئے سب سے پہلے تو آپ کی آگاہی کے لئے یہ گذارش ہے کہ قرآن کے حروف کی گنتی اور انہیں منضبط کرنے کا کٹھن کام ہم سے پہلی نسلوں کے محققین کئی مرتبہ کر چکے ہیں۔ انہیں میں سے دار الشعب، قاہرہ، المصر کی شائع کردہ معروف کتاب **''المعجم المفھرس لاالفاظ القرآنہ الکریم''** ہے جسے محمد فواد عبد الباقی نے مرتب کیا۔ اس

میں قرآن کریم کے حروف کی فہرستیں مرتب کی گئی ہیں۔ اِن کتابوں کے علاوہ آپ میں سے ہر کوئی خواہ وہ عربی پڑھنا جانتا ہو یا نہ جانتا ہو ذاتی طور پر خود مشاہدہ کر کے تصدیق کر سکتا ہے کہ قرآن کی سب سے پہلی آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں حروف کی تعداد 19 ہے۔ اِس میں تو کسی وہم و خیال، اندازے یا تاویل کا کوئی دخل نہیں۔ اسی طرح عربی نہ جاننے کے باوجود کوئی بھی شخص ا،ل،م،ص،ن،ق یا کسی بھی دوسرے حرف کو اچھی طرح پہچان کر قرآن کی کسی بھی سورت میں اس کو خود گنتی کر کے تعداد کی تصدیق کر سکتا ہے۔ بلکہ بہتر یہی ہے کہ خود گنتی کی جائے تاکہ وہم و قیاس کا وسوسہ کامل طور پر ختم ہو جائے۔ پھر بھی ہمیں چاہیے کہ شیطان مردود کے وسوسوں اور مکرو فریب سے بچنے کے لئے اللہ کی پناہ طلب کریں۔ **فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم O**

ممکنہ اعتراضات

سب سے پہلا اعتراض تو یہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ محض اتفاق ہے کہ آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور اس آیت میں آنے والے الفاظ یعنی ''اسم اللہ، رحمٰن اور رحیم'' قرآنِ کریم میں اتنی ہی مرتبہ آ گئے کہ وہ اس کے حروف کی تعداد یعنی 19 پر پورے پورے تقسیم ہو سکتے ہیں۔ اتفاق کے امکان کا جائزہ ہم ایک مثال سے لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ دس دس پیسے والے دس سکے لے کر ان پر پنسل یا مارکر سے ایک سے دس تک نمبر لکھ دیں انہیں اچھی طرح ملا کر اپنی جیب میں ڈال لیں۔ اب آپ اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی سا ایک سکہ نکال لیں۔ یہ سکہ نمبر ایک سے لے کر دس تک کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ اگر آپ یہ چاہیں کہ پہلی مرتبہ نکلنے والا سکہ نمبر ایک ہو تو یہ محض اتفاق ہو گا۔ جس کے واقع ہونے کا امکان دس میں سے ایک ہے۔ پھر آپ اگر یہ چاہیں کہ سب سے پہلے نمبر ایک اور اس کے فوراً بعد نمبر دو سکہ بھی برآمد ہو تو اس قسم کے اتفاق کا امکان تو ہے لیکن سو میں سے ایک ہو گا۔ علیٰ ھذا القیاس اگر آپ چاہیں کہ سارے سکے ترتیب وار ہی نکلتے چلے آئیں تو پانچویں نمبر تک اتفاق کے وقوع پذیر ہونے کا امکان لاکھ میں ایک رہ جائے گا اور دسویں نمبر تک اربوں میں ایک رہ جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اتفاق کا عمل دخل ایک یا دو مرتبہ تو ہو سکتا ہے لیکن اس سے زیادہ مرتبہ محال اور مزید آگے قطعی ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہاں تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے چاروں الفاظ کا قرآن کریم میں اتنی ہی مرتبہ آنا کہ تعداد اُنیس پر تقسیم ہو جائے (جدول نمبر 1) اتفاق کے امکان کو رد کر دینے کے لئے کافی ہے۔ پھر بھی مزید تشفی کے لئے کوئی سی بھی انسانی تصنیف اٹھا لیں خواہ وہ اللہ کی کتاب سے حجم میں میں کم ہی کیوں نہ ہو۔ اب آپ

اس کتاب کے سب سے پہلے جملے کے حروف کی تعداد گن لیجئے۔ اب اس جملے میں استعمال ہونے والے پہلے لفظ کی تعداد اس ساری کتاب میں شمار کیجئے اور دیکھیئے کہ کیا یہ تعداد حروف کی تعداد پر برابر تقسیم ہو جاتی ہے؟ ہو سکتا ہے کہ اتفاق سے ایسا ہو جائے لیکن مذکورہ جملے کو دوسرے لفظ کی تعداد کا بھی اسی طرح تقسیم ہو جانا یقیناً محال ہے اور ان سے اگلے الفاظ کی تعداد کا تقسیم ہو جانا تو ناممکنات میں سے ہے۔

دوسرا اعتراض جو غیر مسلم حضرات کر سکتے ہیں یہ ہو گا کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے بذات خود قرآن مجید کو اس انداز سے تصنیف کیا ہو گا۔ سب سے پہلے تو یہ سوچئے کہ کیا چھٹی صدی میں علم الحساب ترقی کی اس سطح پر پہنچ چکا تھا کہ اس کی مدد سے اس قسم کا پر پیچ نظام تخلیق کیا جا سکتا؟ پھر اس زمانے میں پیدا ہونے والے ایک انسان کے بارے میں جس نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ بھی تہ نہ کیا ہو اس طرح کا مفروضہ قائم کرنا انتہائی مضحکہ خیز اور غیر منطقی ہے کہ اس نے شروع ہی سے اپنے ذہن میں یہ طے کر لیا کہ ایک ایسی کتاب لکھوں گا جس کے پہلے جملہ کے حروف کی تعداد اُنیس ہو گی اور اس جملہ کے الفاظ پوری کتاب میں اتنی تعداد میں آئیں گے کہ اُنیس پر تقسیم ہو جائیں۔ اس کتاب کے بعض ابواب کے شروع میں کچھ حروف (حروف مقطعات) لکھونگا اور ابواب کے اندر اُن حروف کی تعداد اتنی رکھونگا جو انیس پر تقسیم ہو جائے۔ چنانچہ 23 برس کے عرصہ میں اس نے اس دقیق حسابی نظام کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کتاب اس مہارت سے مرتب کر ڈالی نہ تو الفاظ و حروف کی تعداد میں کہیں کوئی غلطی ہونے دی اور نہ ہی کتاب کی فصاحت و بلاغت میں کوئی فرق آنے دیا۔

اس کے باوجود بھی اگر کسی ضد کے پکے کو یہی اصرار ہو کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن مجید کو خود ہی اس انداز سے تحریر کر لیا ہو گا تو اس سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر حضور ﷺ یہ کتاب اس نرالے اور اچھوتے انداز میں خود ہی تحریر فرمائی تو پھر اس قابلِ صد فخر کارنامہ انجام دینے کا انعام کیوں حاصل نہ کیا؟

انہوں نے اس شاہکار تصنیف کے اندر چھپائے گئے راز اور اس کی نزاکتوں کو فاش کر کے اپنی قوم سے داد وصول کیوں نہ کی؟ جب کہ تاریخ میں اس قسم کے حیرت انگیز اور دقیق حسابی نظام کی حامل کسی دوسری تصنیف کی مثال ہی نہیں ملتی۔ انہوں نے شعر و ادب کی دلدادہ اپنی قوم پر اس انوکھی تحریر کے اسرار بیان کر کے اپنے تفوق کا اظہار کیوں نہ کیا؟ ان سوالوں کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا جا سکتا۔ (جاری ہے)

اسلامی معاشرے میں سنت کی اہمیت

محمد اسد

اتباع سنت کیوں ضروری ہے؟

سوال یہ ہے کہ حقیقی اسلامی طرز کی زندگی بسر کرنے کے لئے سنت نبوی کی اتباع کیوں لازمی قرار دی جائے؟ کیا نبی کریم کی حیات طیبہ اور اسوۂ حسنہ سے اخذ کئے ہوئے اعمال و عادات اور اوامر و نواہی کے راستہ کے سوا اسلام کی صداقت کو پانے کا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے؟ بلاشبہ نبی کریمؐ تمام انسانوں میں سب سے افضل تھے لیکن کیا آپ کے متبعین پر آپ کی زندگی کے ہر پہلو کی تقلید کو لازمی قرار دینا انسان کی شخصی اور انفرادی آزادی میں دست اندازی کرنے کے مترادف نہیں ہے؟ اسلام کے خلاف اب تک جو تنقیدیں کی گئی ہیں ان میں ایک پرانا اعتراض یہ چلا آتا ہے کہ سنت نبوی کی سختی کے ساتھ پیروی کرنے کا تاکیدی حکم ہی دراصل بعد کے دور میں دنیائے اسلام کی تباہی کا بڑا سبب بنا کیونکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس قسم کا تاکیدی حکم انجام کار انسان کی آزادیٔ عمل اور معاشرے کی قدرتی نشوونما کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اسلام کے مستقبل کے متعلق یہ بات سب سے زیادہ اہم ہے کہ آیا ہم اس اعتراض کا جواب دینے کے قابل ہیں یا نہیں کیونکہ سنت نبوی کے متعلق ہمارا جو انداز فکر ہوگا اسی سے اسلام کے متعلق ہمارے آئندہ رویہ کا تعین ہو سکے گا۔

ہمیں اس حقیقت پر فخر ہے اور بجا طور پر فخر ہے کہ دین اسلام کی بنیاد کسی مخفی یا باطنی عقیدے پر نہیں رکھی گئی ہے بلکہ اسلام کا دروازہ تو عقل کی ناقدانہ چھان بین کے لئے ہمیشہ کھلا ہوا ہے۔ اس لئے ہم کو نہ صرف یہی جاننے کا حق پہنچتا ہے کہ سنت نبوی کی اتباع ہم پر لازمی قرار دی گئی ہے۔ بلکہ یہ معلوم کرنے کا بھی حق حاصل ہے کہ اس کو لازمی قرار دینے کی وجہ کیا ہے۔

یہاں ہم ایک ایسا مسئلہ پیش کر رہے ہیں جس پر بڑے خاص غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اسلام یہ بتاتا ہے کہ انسان ایک مقصد کے تحت اپنی زندگی کے تمام تصورات کو کیوں کر یک جا کر سکتا ہے اور خود یہ دین بھی اپنے اندر تصورات کی ایک ایسی کلیت پیش کرتا ہے۔ جس میں نہ تو کسی چیز کا اضافہ ہی کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی چیز کی کمی۔ اسلام میں اصطفائیت کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ اسلام کی ان تعلیمات کو جن کے متعلق یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ فی الواقعی انہیں قرآن

پاک یا نبی کریمؐ نے پیش فرمایا ہے من وعن اور بلا کم و کاست قبول کر لیں ورنہ ہمارے حق میں ان تعلیمات کی کوئی حقیقی قدر باقی نہیں رہے گی۔ اسلام کے بارے میں یہ سمجھنا ایک بنیادی غلطی ہے کہ ایک عقلی مذہب ہونے کی حیثیت سے اسلام اپنی تعلیمات کو "انفرادی پسند" کے لئے کھلا چھوڑ دیتا ہے، یہ مکروہ دعویٰ دراصل عقل پرستی کے عام غلط تصور کا نتیجہ ہے۔ آج کل عقل اور عقل پرستی کے جو معنی لئے جاتے ہیں ان میں بہت بڑا فرق ہے۔ عقل اور عقل پرستی کے معنوں کے اس باہمی فرق کو ہر زمانے کے فلاسفر تسلیم کر چکے ہیں۔ مذہبی تعلیمات کے تعلق سے عقل کی حیثیت صرف ایک ایسے احتسابی کردار کی سی ہے جس کا فرض منصبی صرف یہ دیکھنا ہے کہ نفس انسانی پر کوئی ایسا بوجھ تو نہیں لادا جا رہا ہے جس کو وہ آسانی یعنی فلسفیانہ بازی گری کی مدد کے بغیر برداشت نہ کر سکتا ہو اور جہاں تک مذہب اسلام کا تعلق ہے غیر جانبدار اور غیر متعصب عقل اس کو کلی طور پر تسلیم کر چکی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہر شخص اسلامی تعلیمات کو دیکھتے ہی انہیں اپنے حق میں مفید سمجھ کر قبول کرے گا۔ ان تعلیمات کا قبول کرنا یا نہ کرنا تو اصل میں طبیعت و مزاج کا معاملہ ہے۔ روحانی بصیرت یا قرآن پاک کے الفاظ میں ہدایت کا معاملہ ہے، جس کو ہدایت نصیب ہوگی وہی انشراح صدر کی دولت سے سرفراز ہوگا لیکن پورے وثوق اور ایقان کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی غیر جانبدار اور غیر متعصب آدمی یہ کبھی نہیں کہے گا کہ قرآن پاک میں کوئی خلاف عقل چیز موجود ہے۔

عقل پرستی کی قباحت

ہم بتا چکے ہیں کہ مذہبی معاملات میں عقل کو صرف اسی قدر دخل ہے کہ وہ کسی قسم کی مزاحمت پیش کئے بغیر احتساب یا نگرانی کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ گویا وہ ایک ایسا آلہ ہے جس کا کام صرف یہ ہی ہے کہ وہ حالات کے مطابق "ہاں" یا "نہیں" کہہ دے۔ لیکن عقل پرستی کا معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ عقل پرستی صرف منصب احتساب یا نگرانی پر قانع نہیں بلکہ وہ تو مخالف اور تردیدی قیاسات کے میدان میں بے تحاشہ کود پڑتی ہے۔ یہ بے لوث عقل کی طرح سچائی کو ماننے والی اور تعصب سے دور رہنے والی نہیں بلکہ بے انتہا قسم کی متعصب اور تنگ مزاج واقع ہوئی ہے۔ عقل تو اپنے حدود کو پہچانتی ہے اور اپنے دائرہ ممکنات سے بخوبی واقف ہوتی ہے۔ لیکن عقل پرستی کا تو یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا اور اس کے تمام اسرار و رموز کا احاطہ کر سکتی ہے۔ اس کے تعصب کا اندازہ اس

CamScanner

سے کر لیجئے کہ وہ مذہب میں ایسی چیزوں کے وجود کے امکان کو ماننے کے لئے قطعاً تیار نہیں ہے جو عارضی یا دائمی طور پر انسانی فہم و ادراک سے ماورائی ہیں حالانکہ وہ سائنس میں ایسی چیزوں کے وجود کے امکان کو بخوشی تسلیم کر لیتی ہے۔

اتباع سنت سے گریز کا سبب بھی عقل پرستی ہے

اور جن وجوہ کی بنا پر جدید زمانے کے بہت سے مسلمان نبی کریمؐ کی سنت کی اتباع کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے ان میں ایک وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اسی نامعقول عقل پرستی کو جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے حد سے زیادہ اہمیت دے رکھی ہے۔ لیکن آج یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ادراک انسانی کے ممکنات کا دائرہ بالکل محدود ہے ہمیں کانٹ جیسے کسی بڑے فلسفی کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ حقیقت تو اظہر من الشمس ہے ہمارا ذہن تو اپنے مزاج کے اعتبار سے کلیت کے تصور کو سمجھنے ہی سے قاصر ہے ہم تو صرف اشیاء کی تفصیلات کا ادراک کر سکتے ہیں لیکن ہمیں یہ پتہ نہیں کہ لامتناہیت یا ابدیت کیا ہے؟ اور نہ زندگی کی ماہیت ہی سے ہم واقف ہیں۔ ایک ایسے مذہب کے مسائل کے معاملہ میں جس کی اساس فوق تجربی اصولوں پر رکھی گئی ہو ہم کو لازماً ایک ایسے رہبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کا نفس ہم جیسے عام انسانوں کے مقابلہ میں عمدہ ترین عقل اور روحانی اوصاف کا مالک ہو۔ ہمیں ایک ایسی ہستی کی ضرورت ہوتی ہے جس کا ضمیر روشن ہو۔ دوسرے الفاظ میں ہمیں ایک نبی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ہم قرآن پاک کو کلام اللہ مانتے ہیں اور اگر ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ محمدؐ نبی تھے تو پھر ہم پر نہ صرف اخلاقی اعتبار سے ہی بلکہ عقلی اعتبار سے بھی اس امر کی پابندی عائد ہو جاتی ہے کہ ہم آنکھ بند کر کے آپؐ کی اتباع کریں۔ یہاں آنکھ بند کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے قوائے عقلیہ سے بالکل ہی کام نہ لیں۔ نہیں بلکہ ہمیں ان قویٰ سے اپنی بہترین صلاحیت و استعداد کے مطابق کام لینا ہوگا۔ ہم کو چاہیے کہ ان احکام کے حقیقی معنی و مطالب کو سمجھنے کی کوشش کریں جو نبی کریمؐ نے ہم تک پہنچائے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ عین فرض ہو جاتا ہے کہ ہر صورت میں اور ہر حالت میں ہم ان احکام کی تعمیل کریں خواہ ہم ان کے بنیادی مقاصد کو سمجھنے کے قابل ہوں یا نہ ہوں۔

یہاں ایک کمانڈر اور سپاہی کی مثال کو لے لیجئے۔ فرض کیجئے کہ ایک کمانڈر اپنے سپاہی کو ایک

اہم فوجی علاقے پر قبضہ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ سپاہی فوری طور پر اس کا حکم بجا لائے گا۔ اگر حکم کی بجا آوری کے دوران سپاہی کمانڈر کے مافی الضمیر کو جان لے اور اس کے حکم کی اصل غرض و غایت کو سمجھ لے تو یہ بڑی اچھی بات ہوگی لیکن اگر سپاہی میں فوری طور پر اپنے کمانڈر کے حکم کی غرض و غایت کو سمجھنے کی اہلیت نہ ہو تو اس کو کمانڈر کا حکم ٹالنے یا اس کی بجا آوری کو کسی عرصہ کے لئے ملتوی کر دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہم مسلمان نبی کریمؐ پر اس حیثیت سے ہی اعتبار کرتے ہیں کہ آپ بنی نوع انسان کے بہترین کمانڈر تھے اور ہم قدرتی طور پر بھی یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہمارا کمانڈر ہمارے مقابلہ میں کہیں زیادہ عمدہ طریقہ سے اقلیم مذہب کے چپہ چپہ سے واقف تھا اور اس کو اس اقلیم کے روحانی اور معاشرتی دونوں پہلوؤں کا پورا پورا علم تھا کسی چیز کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیتے وقت نبی کریمؐ کے پیش نظر ہمیشہ ایک بنیادی مقصد ہوا کرتا تھا جس کو آپ انسان کی روحانی یا سماجی فلاح کے لئے ناگزیر خیال فرماتے تھے۔ کبھی کبھی تو آپ کا یہ مقصد عام آدمی کی بے بصیرت نگاہوں کے سامنے بہت ہی واضح طور پر نمایاں ہو جاتا تھا۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کی صرف دھندلی سی شکل دکھائی دیتی ہے کبھی کبھی ہم نبی کریمؐ کے حکم کے مطالب کو بآسانی سمجھ لیتے ہیں اور کبھی ہم صرف اس کے سطحی معنوں کو سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ صورت خواہ کچھ ہی ہو ہم پر نبی کریمؐ کے تمام احکام کی بجا آوری کی پابندی عائد ہوتی ہے بشرطیکہ ان احکام کی سند قائم ہو چکی ہو۔ بس اس کے سوا اور کوئی متبادل صورت نہ ہوگی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ نبی کریمؐ کے بعض احکام ایسے ہیں جو بظاہر غیر معمولی اہمیت کے حامل نظر آتے ہیں اور بعض احکام اس قدر اہم دکھائی نہیں دیتے۔ ہم کو چاہیے کہ زیادہ اہمیت والے احکام کو کم اہمیت والے احکام پر ترجیح دیں لیکن آپ کے کسی حکم کو محض اس بنا پر کہ وہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ رد کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں نبی کریمؐ کی شان میں قرآن پاک کا ارشاد ہے کہ:

"وہ اپنے جی سے کوئی بات نہیں کہتے" (القرآن)

اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ نبی کریمؐ کوئی بات صرف اس وقت کہتے ہیں جبکہ کوئی واقعی ضرورت پیدا ہوتی ہے، اور وہ اس لئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیتا ہے اسی وجہ سے ہم پر حدیث کے ظاہر و باطن کی اتباع کا فریضہ عائد ہوتا ہے اور اس کے بغیر ہم روح اسلام کے سچے وفادار نہیں بن سکتے۔

جب ایک دفعہ ایک مسلمان کے لئے نبی کریم کی اتباع کی حقیقی ضرورت ثابت ہو جاتی ہے۔ تو اس کو نہ صرف یہ حق پہنچتا ہے بلکہ اس کا فریضہ ہو جاتا ہے کہ وہ اسلام کی ہیئت دینی و معاشرتی میں سنت کا مقام معلوم کرے۔ کیا ہدایت و رہبری کے قوانین و ضوابط کے اس عظیم اور مفصل نظام کا کوئی روحانی مطلب ہے جو ایک مسلمان کی زندگی پر مہد سے لے کر لحد تک چھایا ہوا ہے اور جو اس کے وجود کی اہم ترین اور انتہائی غیر اہم دونوں قسم کی منزلوں میں اس کے رویہ کو منضبط کرتا ہے۔ یا واقعی سرے سے اس عظیم الشان نظام کا کوئی روحانی مطلب ہی نہیں ہے؟ کیا نبی کریمؐ نے اپنے متبعین کو سنت کی پیروی کا جو حکم دیا ہے۔ اس میں کوئی بھلائی مضمر تھی، اگر میرے دونوں ہاتھ یکساں طور پر پاک ہوں تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ اگر میں کھانا دائیں ہاتھ سے کھاؤں یا بائیں ہاتھ سے، کیا فرق پڑ جائے گا اگر میں داڑھی رکھوں یا منڈوا دوں۔ کیا یہ چیزیں محض رسمی نہیں ہیں؟ کیا انسان کی ترقی یا معاشرہ کی بھلائی سے ان چیزوں کا کوئی تعلق ہے؟ اگر نہیں ہے تو ان کی پابندی ہم پر کیوں عائد کر دی گئی؟

وقت آ گیا ہے کہ ہم لوگ جو یہ یقین کرتے ہیں کہ اسلام کی بقاء اور زوال کا مسئلہ سنت نبوی سے وابستہ ہے۔ ان تمام سوالوں کے مدلل جواب دیں۔

جہاں تک ہمیں علم ہے قیام سنت کے کم از تین صریح وجوہ ہیں۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ انسان کو ایسی باضابطہ تربیت ملنی چاہیے کہ وہ باطنی شعور، دل کی بیداری اور احتساب نفس کی فضا میں مستقل طور پر زندگی بسر کرنے کے قابل بن جائے، بے ربط اعمال اور عادات جو انسان کی روحانی ترقی میں سد راہ ہو جاتے ہیں ان کو ممکنہ حد تک ختم کر دینا ضروری ہے کیونکہ ان سے یکسوئی تباہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ضروری ہے کہ ہماری مشیت ہی ہمارے ہر فعل کا تعین کرے اور ہمارا ہر فعل اخلاقی احتساب کے تابع کر دیا جائے۔ لیکن ہم ایسا کرنے کے قابل اسی وقت ہی ہو سکیں گے جبکہ اپنے نفوس کا جائزہ لینا سیکھ لیں۔ ہر مسلمان میں ایک مستقل احتساب نفس کی ضرورت کو حضرت عمرؓ نے بڑے خوبصورت انداز میں بیان فرمایا ہے:-

اس سے پہلے کہ تمہارے اعمال کا حساب لیا جائے تم اپنے نفس کا حساب لے لو۔

اور اس قول کی تصدیق حدیث نبوی کے ذریعہ اس سے کہیں زیادہ بہتر انداز میں ہوتی ہے۔

"اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو گویا وہ تجھے دیکھ رہا ہو"

اسلام کا تصور عبادت صرف نمازوں ہی کو نہیں بلکہ فی الحقیقت ہماری ساری زندگی کو محیط ہے۔ اس کا نصب العین یہ ہے کہ ہماری روحانی اور مادی "انا" ایک ہی ذات واحد میں مدغم کر دی جائے۔ اس لئے ہماری کوشش صاف صاف یہ ہونی چاہیے کہ ہم اپنی زندگی میں سے غیر شعوری اور غیر اختیاری عوامل کو امکانی حد تک نکال باہر کر دیں۔ اس راہ میں ہمارا پہلا قدم نفسی جائزہ ہوگا اور نفسی جائزہ کی تربیت حاصل کرنے کا سب سے کامیاب طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کے تمام غیر اہم اعمال کو وقتاً و یا احتساب میں لے آئیں۔ تربیت نفس کے ضمن میں ہم جن غیر اہم اور چھوٹے چھوٹے اعمال کا ذکر کر رہے ہیں۔ وہ دراصل زندگی کے بڑے بڑے اعمال کے مقابلہ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ بڑی چیزیں اپنے بڑے ہونے کی وجہ سے صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہیں اور اس لئے وہ بہت بڑی حد تک ہمارے حیطہ شعور کے اندر رہتی ہیں لیکن دوسری تمام چھوٹی چھوٹی اور غیر اہم چیزیں ہماری نظر بچا لیتی ہیں اور ہمارے احتساب کو چکر دے جاتی ہیں۔ لہذا ہمارے چھوٹے چھوٹے اور غیر اہم اعمال ہی گویا بہت ہی زیادہ قیمتی مدرکات ہیں۔ جن پر ہم احتساب نفس کی قوتوں کو گھس گھس کر تیز کر سکتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ یہ چیز بظاہر کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو کہ ہم کون سے ہاتھ سے کھانا کھاتے ہیں۔ ہم داڑھی رکھتے ہیں یا منڈوا دیتے ہیں۔ لیکن اصولی اعتبار سے یہ چیزیں اس وقت بے انتہا اہمیت کی حامل بن جاتی ہیں جبکہ ہم اپنے تمام امور کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت باقاعدگی کے ساتھ انجام دے رہے ہوں، اپنے آپ کو نفسی جائزہ اور اخلاقی احتساب کی مسلسل کشمکش میں مبتلا رکھنا تو قطعاً آسان نہیں ہے خواہ ہمارے یہ اوصاف کتنے ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو جائیں۔ نفس کی کاہلی، جسم کی کاہلی سے کم حقیقی نہیں ہے۔ اگر آپ ایک ایسے شخص سے جو بیٹھے ہی بیٹھے اپنے کاروبار انجام دینے کا عادی بن چکا ہو ایک لمبا فاصلہ پیدل طے کرنے کے لئے کہیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ بہت جلد تھک جائے گا اور اس میں آگے چلنے کی سکت باقی نہ رہے گی۔ لیکن یہ حالت اس شخص کی نہیں ہوگی جو زندگی بھر دوڑ دھوپ کا عادی رہا ہو، اس کی نظر میں تو اس قسم کی جسمانی محنت قطعاً محنت نہ ہوگی بلکہ اس کے برعکس جسم کا ایک خوش گوار عمل ہوگا جس کا وہ عادی ہو چکا ہے ہم جو عمل کرتے ہیں اور جو بالقصد یا بلا قصد چھوڑ دیتے ہیں، ان سب کو کسی عقلی امتیاز کا تابع کر دینے کا

مسلسل مطالبہ کیا جاتا رہے تو نفسی جائزہ کی قوت اور اس کا میلان باقاعدگی کے ساتھ نمو پاتے ہوئے ہماری عادت ثانیہ بن جائیں گے اور جب تک اس قسم کی تربیت کا سلسلہ جاری رہے گا ہماری اخلاقی کاملی روز بروز گھٹتی چلی جائے گی۔

سنت کا اتباع پورے شعور کے ساتھ ہو

ہم نے تربیت کی جو اصطلاح اوپر استعمال کی ہے اس کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ تربیت پانے والے کو اپنے عمل کا پورا پورا شعور ہے کیونکہ جب کبھی اتباع سنت کی عادت ایک پٹے بنائے روزمرہ کے معمول کی صورت اختیار کر لیتی ہے یعنی عامل سنت کو جب اپنے عمل کا پورا پورا شعور نہیں رہتا تو سنت کی تعلیمی قدر بالکل ختم ہو جاتی ہے گذشتہ صدیوں میں مسلمانوں کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جب صحابہ کرامؓ اور تابعین نے اپنی زندگیوں کے ایک ایک نقش کو اپنے آقائے نامدار کی حیات پاک کے مطابق بنانے کی کوشش کی تو ان کی یہ کوشش اس شان کی تھی کہ انہوں نے اپنا سر اطاعت اس رہنمائے مشیت کے آگے پوری آگہی اور جذبہ کامل کے ساتھ خم کر دیا جو ان کی زندگیوں کو روح قرآن کے قالب میں ڈھال سکتی تھی اور اسی آگہی اور اسی جذبہ کامل کی بدولت یہ حضرات تربیت یا اتباع سنت کے تمام ممکنہ فیوض و برکات سے شادکام ہو سکے اگر بعد کے مسلمانوں نے ان نفسیاتی راہوں سے صحیح استفادہ نہیں کیا جو طریق سنت نے ان پر کھول رکھی تھیں تو اس میں خود اس طریق کا کوئی قصور نہیں ہے مسلمانوں سے یہ فروگزاشت غالباً بڑی حد تک اس عجمی تصوف ہی کے زیر اثر ہوئی تھی جس نے انسان کی تمام عملی توانائیوں کے خلاف اپنی نفرت کا اعلان کر رکھا تھا۔ چونکہ طریق سنت آغاز اسلام ہی سے اسلام کی دینی زندگی کا جزو بن چکا تھا اس لئے اس تصوف کو اصولی طور اس کی بیخ کنی میں کامیابی نہ ہو سکی۔ البتہ اس کو سنت کی عملی قوت اور کسی حد تک اس کی افادیت کو معطل اور بے رنگ کرنے میں کامیابی ہو گئی اور سنت صوفیوں کے نزدیک محض افلاطونی اہمیت کا ایک تصور بن کر رہ گئی۔ البتہ اس کا ایک متصوفانہ پس منظر ضرور تھا۔ متکلمین کے نزدیک سنت نے ایک نظام قانون کی اور جمہور مسلمین کے نزدیک ایک بے معنی سے خالی خولی خول کی صورت اختیار کر لی۔ باوجود اس کے کہ مسلمان قرآنی تعلیمات اور سنت نبویؐ کے ذریعہ ان کی تعبیروں سے کماحقہ استفادہ کرنے میں ناکام رہے ان تعلیمات و نیز ان کی تعبیروں کا جو بنیادی تصور چلا آ رہا ہے، اس کی سالمیت میں کوئی فرق نہیں

آیا۔ پھر تو کوئی وجہ نہیں پائی جاتی کہ سنت کو پھر ایک دفعہ اسی اگلی سی اسپرٹ کے ساتھ قائم نہ کیا جائے۔ طریق سنت کا حقیقی مقصد، جیسا کہ بعض کینہ پرور ناقدوں کا خیال ہے "طریقیوں یا دستور پرستوں کی افزائش" نہیں بلکہ ذی شعور اولوالعزم اہل دل اور صاحب عمل انسانوں کی افزائش ہے۔ صحابہ کرامؓ اسی قسم کے انسان تھے۔ دوامی شعور، دل کی بیداری اور ہر قسم کے اعمال میں ذمہ داری کا پورا پورا احساس۔ یہی وہ اوصاف جلیلہ ہیں جن میں ان کی معجزنما کارکردگی اور حیرت انگیز تاریخی کامرانیوں کا راز پوشیدہ ہے۔

سنت کی معاشرتی اہمیت

یہ سنت کا پہلا اور منفرد پہلو تھا۔ اس کا دوسرا پہلو اس کی معاشرتی اہمیت اور افادیت ہے۔ اس بات میں تو کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ اکثر سماجی اختلافات اور آویزشیں دراصل لوگوں کے ایک دوسرے کے اعمال اور ارادوں کو غلط طور پر سمجھ لینے کا نتیجہ ہوتی ہیں اور اس غلط فہمی کا سبب سوسائٹی کے افراد کے طبائع اور رجحانات کی بے انتہا گونا گونی ہے۔ مختلف طبائع انسان کے اندر مختلف عادتیں پیدا کر دیتی ہیں اور مختلف عادتیں مرور زمانہ سے راسخ ہو کر افراد کے درمیان رکاوٹیں بن جاتی ہیں۔ برخلاف اس کے اگر دو یا دو سے زائد افراد کی عادتیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہوں تو ان میں باہمی ہمدردانہ روابط اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی خاصیت پیدا ہونے کا بڑا امکان ہوتا ہے۔ اسی لئے اسلام جس کو سماج کی بھلائی کی طرح انفرادی بھلائی سے بھی یکساں لگاؤ ہے اس امر کو ناگزیر قرار دیتا ہے کہ سوسائٹی کے تمام افراد کو اپنی اپنی عادتوں اور رسموں کو ایک دوسرے سے مشابہ کرنے کی باضابطہ طریقہ سے ترغیب دلائی جائے، خواہ ان افراد کے سماجی اور معاشی مراتب ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔

مزید برآں سنت، معاشرہ کی ہیئت ترکیبی میں یکسانیت اور استحکام پیدا کرتی ہے اور ایسے اضداد اور اختلافات کو پنپنے نہیں دیتی جنہوں نے "سماجی مسائل" کی نقاب ڈال کر مغربی سوسائٹی میں بڑی پراگندگی پھیلا رکھی ہے۔ اس قسم کے سماجی مسائل اس وقت پیدا ہوتے ہیں جبکہ کوئی آئین یا رسوم بذاتہ نامکمل خیال کئے جاتے ہیں اور اسی بنا پر وہ تنقیدات اور بڑھتے ہوئے تغیرات کے ہدف بن جاتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک یعنی ان لوگوں کے نزدیک جو اپنے آپ کو قرآنی قانون اور نتیجۃً احکام نبوی کے پابند گردانتے ہیں۔ معاشرہ کے کوائف و احوال غیر

تغیر پذیر اور مستحکم ہونے چاہییں۔ کیونکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک فوق تجربی اصل سے ہیں اور جب تک اصل کے بارے میں کوئی شبہ پیدا نہ ہوگا معاشری نظام کو متغیر کرنے کی نہ تو کوئی ضرورت پیش آئے گی اور نہ کوئی خواہش ہی پیدا ہوگی اور صرف اسی بنا پر ہم قرآن پاک کے اس مطالبہ کے عملی امکان کا تصور کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کو "بنیان مرصوص" ہونا چاہیے۔ اگر ہم اس اصول کا اطلاق کما حقہ، طریقہ پر کریں تو معاشرہ کو اپنی ساری توانائیاں ضمنی مسائل اور معاشرتی اصلاحات جیسی عارضی قدر والی چیزوں پر صرف کرنے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ اسلامی معاشرہ جو منطقی انتشار سے پاک وصاف ہے اور جس کی عمارت الٰہی قانون کی ٹھوس بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے اپنی تمام قوتوں کو حقیقی مادی اور ذہنی بھلائی کے مسائل کے حل کی تلاش میں استعمال کرسکتا ہے اور اس طریقہ سے وہ فرد کے لئے روحانی جدوجہد کی راہیں ہموار کر سکتا ہے یہی اور صرف یہی حقیقی دینی مقصد ہے اسلام کے معاشری نظام کا۔

سنت کی پابندی میں سختی ضروری ہے

اب ہم سنت کے تیسے پہلو کا ذکر کریں گے اور یہ بتلائیں گے کہ اس کی سختی کے ساتھ پابندی کرنے کی ضرورت کیوں ہے؟

طریق سنت کی پیروی میں ہم اپنی روزمرہ زندگی کے ایک ایک عمل کو نبی کریمؐ کے اسوۂ حسنہ کے رنگ میں رنگ لیتے ہیں کسی چیز کو کرنے یا نہ کرنے کے سلسلہ میں ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آیا نبی کریمؐ سے ایسا کوئی قول یا فعل ہوا تھا یا نہیں اور اس طرح ہماری روزمرہ زندگی پر دنیا کے عظیم ترین انسان کی شخصیت کا رنگ غالب آ جاتا ہے اور ہمارے وجود میں آپ کا روحانی اثر ایک حقیقی اور دوامی عامل کی طرح جاگزیں ہو جاتا ہے اور جب شعوری اور غیر شعوری طور پر ہر معاملہ میں نبی کریمؐ کے طریق کار معلوم کرنے کا شوق ہم میں پیدا ہو جائے گا تو ہم آپ کو نہ صرف پیغمبر اخلاق ہی کی حیثیت سے بلکہ حیات کامل کا راستہ دکھانے والے ہادی کی حیثیت سے بھی ماننے لگ جائیں گے۔ یہاں اب ہم کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا ہم نبی کریمؐ کو دیگر عام دانشوروں کی طرح ایک دانشور مانیں یا اللہ کے رسولوں کا سردار مانیں جس کا ہر عمل وحی باری تعالیٰ کا ترجمان ہے قرآن پاک کا نقطہ نظر تو اس معاملہ میں ہر قسم کی غلط فہمیوں سے پاک ہے۔ ایک ایسی

CamScanner

ذات جو دنیا جہاں کے لئے رحمت بنا کر بھیجی گئی ہو اس کے متعلق اس کے سوا اور کیا سوچا جا سکتا ہے کہ وہ دوامی طور پر اپنے رب کے فیضان حاصل کرتی رہتی ہے اور اس ذات قدسی صفات کی ہدایت کو کلی یا جزوی طور پر ترک کر دینے کے معنی اس کے سوا کیا ہو سکتے ہیں کہ ہم خود اللہ کی رحمت سے منہ پھیر رہے ہیں یا اس کی وقعت گھٹا رہے ہیں۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلے گا کہ گویا اسلام کا سارا پیغام کامل اور آخری پیغام نہیں تھا بلکہ انسانوں کے مسائل کا ایک متبادل حل تھا اور یہ بات ہمارے اختیار تمیزی پر چھوڑ دی گئی ہے کہ چاہے ہم اس حل کو منتخب کریں یا اسی قبیل کے دوسرے صحیح اور مفید حل کو منتخب کریں۔ یہ نظریہ ہماری رہبری دوسری تمام راہوں میں تو کر سکتا ہے لیکن اسلام کی روح کی طرف نہیں لے جا سکتا جس کے بارے میں قرآن پاک کا ارشاد ہے:۔

"آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا"

سنت کا ترک گویا اسلام سے روگردانی ہے

اور ہم اسلام کو تمام مذاہب کے مقابلہ میں اس لئے افضل مانتے ہیں کہ وہ زندگی کی کلیت پر حاوی ہے۔ یہ مذہب دنیا اور آخرت، روح اور جسم، فرد اور معاشرہ کا یکساں لحاظ رکھتا ہے، یہ مذہب نہ صرف فطرت انسانی کے عظیم الشان امکانات ہی ملحوظ رکھتا ہے بلکہ اس کے خلقی حدوں کو بھی، یہ مذہب ہم پر ایسی ذمہ داریاں عائد نہیں کرتا جس کے ہم متحمل نہ ہو سکتے ہوں یا جو ہمارے دائرہ امکان سے باہر ہو (بلکہ وہ تو ہم کو اپنی ممکنہ صلاحیتوں سے بہتر طریقہ سے تمتع پذیر ہونے کی تدبیر سمجھاتا ہے اور ہمیں سچائی کی ایسی بلندی پر پہنچاتا ہے جہاں خیال و عمل کے مابین نہ تو کوئی خلیج ہی حائل ہوتی ہے اور نہ کوئی اختلاف) اسلام کی راہ دوسری راہوں کے جیسی ایک راہ نہیں بلکہ وہ ایک منفرد راہ ہے۔ الصراط! اور جس انسان کامل نے اسلام کی تعلیمات ہم تک پہنچائی ہیں دوسرے رہنماؤں کی طرح کا رہنما نہیں بلکہ ایک منفرد رہنما ہے۔ الھادی! اس کے اعمال و احکام کی اتباع کرنا گویا اسلام کی اتباع کرنا ہے اور اس کی سنت کو ترک کر دینا گویا خود اسلام سے منہ موڑ لینا ہے۔

پاکستان کی اسلامی تعمیر نو
ایک انتخاب یا ضرورت

کے ایم اعظم

پاکستان ایک پاکیزہ قطعہ ارضی اور اخلاقیات کی تنزلی

پچھلے بیس سالوں کے دوران جو کہ میں نے وطن سے باہر گزارے ہیں، جب کبھی بھی پاکستان آنا نصیب ہوا حالات کو ہر دفعہ پہلے سے بدتر پایا۔ اس کی وجہ صرف طبعی اور سماجی ساخت کی اندرونی زبوں حالی نہیں تھی بلکہ عوام الناس میں اخلاقی تنزلی کا عمل پیہم تھا۔ اسی کی وجہ تھی کہ جو کچھ میں سنتا تھا وہ اس سے بدتر تھا جو کہ شہادہ میں آتا تھا۔ باہمی خیر سگالی اور اعتماد کے مفقود ہونے سے عوام الناس نے دوسروں کی خامیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا شروع کر دیا تھا جبکہ اپنی برائیوں اور گناہوں کو ہر کوئی نظر انداز کرتا تھا۔ صد افسوس کہ یہ پاک سرزمین اخلاقی گراوٹ اور ظلم و استبداد کا شکار ہوگئی۔

صاحب اقتدار بغیر سیاسی فراست کے اور حاملین فراست بغیر اقتدار کے

آج پاکستان تاریخ کے اس چوراہے پر کھڑا ہے، جہاں سے وہ صدق، اخلاص اور قومی جذبہ کا ارفع راستہ اختیار کر کے نہ صرف اپنا تحفظ کر سکتا ہے، بلکہ مسلم امہ اور اقوام عالم میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ تاہم جب عام شہری کو اس خوفناک صورت حال کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنے ناکافی حالات میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ پڑھا لکھا ممتاز طبقہ جسے عوام کی راہنمائی کرنی ہوتی ہے، اپنے خلط ملط تخیلات اور خود غرضی کی وجہ سے اپنے آپ کو مایوسی کا شکار پاتا ہے۔

اگر ہمارے اس ملک عزیز میں چند ایک افراد صحیح سوچ اور تصورات کے حامل ہیں تو وہ صاحب اقتدار نہیں اور جو صاحب اقتدار ہیں وہ صحیح سوچ سے عاری ہیں۔

تمام فرمانروا ظالم اور غدار ہیں۔ فرق صرف طریق کار کا ہے

پاکستان کی سیاست صرف دولت کا کھیل بن چکی ہے اور تعلیمی معیار اور اخلاقیات سے مبرا ہو کے یہ ظالموں اور غداروں کی ایک زرخیز کھیتی میں تبدیل ہوگئی ہے۔ جو کوئی برسر اقتدار آتا ہے وہ اپنے سے پہلے آنے والوں کے ظلم میں کمی نہیں بلکہ واضح اضافہ کرتا ہے۔

امہ مسلمہ : ایک اذیت کی پکار

پوری اسلامی دنیا میں بھی پاکستان کے مایوس کن حالات کی برابر عکاسی کرتی ہے۔ ایک طرف مسلم امہ کو خلیج کی جنگ میں ذلت اور خواری کا سامنا کرنا پڑا تو دوسری طرف بوسینا اور کشمیر کے مسلمانوں کا مسلسل قتل عام ان کی بے یاری و مددگاری کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ واقعات مغربی طاقتوں کی اسلام دشمنی اور اسلامی دنیا کی بہت سی پوشیدہ کمزوریوں کے لئے اظہر من الشمس ہیں۔ اسلامی دنیا تاریخی تغیر و تبدل کے باوجود ایک ناقابل تسخیر یقین کی حامل تھی۔ اب مندرجہ بالا حالات کی وجہ سے یہ یقین متزلزل ہو گیا ہے۔

اسلام : ایک حق انتخاب یا ضرورت

ان حالات کے نتیجہ میں بعض لوگ اسلام کے متعلق شکوک و شبہات میں مبتلا ہوئے ہیں کہ شاید ہماری بدقسمتی اسلام ہی کی وجہ سے ہے اور یہ کہ ہر چیز صحیح ہو جائے گی اگر ہم کلیتاً اسلام کو بالائے طاق رکھ دیں یا کم از کم اس کے سماجی اور سیاسی مقاصد کو خیر باد کہہ دیں۔ بالالفاظ دیگر اسلام کو محض ایک ذاتی مذہبی رسومات کے پلندہ میں تبدیل کر دیں اور اس کی مقرر کردہ سماجی، معاشرتی اور سیاسی ذمہ داریاں سے عہدہ براہونے کی سوچ کو یکسر تبدیل یا ختم کر دیں۔ درحقیقت یہی مغربی طاقتوں کا منشائے مقصود ہے کہ وہ مسلمانوں کے انقلابی دین کو محض ایک رسوماتی مذہب میں تبدیل کر دیں جس کا کوئی سیاسی مقصد نہ ہو۔ اس کام کے لئے خاصے ذرائع استعمال کئے جا رہے ہیں۔ یہی سوال ایک دوسرے پیرائے میں بھی اٹھایا جا رہا ہے کہ اگر ہم حقیقتاً اسلامی قوانین کو اپنانا نہیں چاہتے تو پھر اس کے بارے میں خوامخواہ اونچی اونچی باتیں کر کے امریکہ کو کیوں ناراض کرتے ہیں بالخصوص جبکہ اسرائیلی لابی کھلے طور پر ہر اس مسلمان ملک کو جو ترقی کی منازل سے ہمکنار ہوتا ہے تباہ و برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے۔

اس ضمن میں ایک خاص سوال اٹھتا ہے کہ کیا واقعی ہم اسلام کو خیر باد کہہ سکتے ہیں؟ گو یہ سوال بیشتر پاکستانیوں کے لئے برمحل نہیں تاہم تاریخ اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ اللہ جل مجدہ کی انسانیت کے لئے آخری راہنمائی ہونے کی وجہ سے یہ بات ناقابل عمل ہے کہ اسلام سے گلو خلاصی کر لی جائے۔ اگر ہم اپنے اس دین کو چھوڑ بھی دیں تب بھی دشمنان اسلام اس بات کو کبھی

نہیں مانیں گے کہ ہم واقعتاً ایسا کر چکے ہیں۔ بوسینا کے یورپی مسلمانوں کی اعتدال پسندی کے باوجود جو حال ان کا کیا جا رہا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

اس مسئلہ کو اگر ایک اور زاویہ سے دیکھا جائے تو یہ مسئلہ اسلام کا نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی نظام بھی اس اخلاقی زبوں حالی میں نہیں چل سکتا جس کا ہم آج کل شکار ہیں۔ ہماری تباہی کا موجب اسلام نہیں بلکہ ہماری تباہی اسلام کے باوجود ہے۔ قرآن حکیم اور فرقان حمید کے مطابق ہم میں سے چند ایک ہی مسلمان کہلا سکتے ہیں۔

ہمارے لئے چیلنج

آج ہم پاکستانی کئی ایک خطرات کا سامنا کر رہے ہیں۔ نہ صرف طبعی خطرات مثلاً خود اعتمادی کے کھو جانے کے ممکنہ نقصانات جو کہ ہماری اندرونی طاقت اور روحانی ولولہ انگیزی کو ختم کر دیں گے۔ جبکہ اسلام جو کہ انسانیت کے لئے اللہ تعالیٰ کا آخری پیام کامل ہے بہر حال کامیاب ہوگا۔ ہمارے لئے تو فیصلہ کن سوال یہ ہے کہ کیا ہماری پاکستانی مسلمانوں کی موجودہ نسل ان مبازرت طلبیوں سے عہدہ براہو سکے گی جن کا اس کو آج سامنا ہے۔ اور ان مواقعات پر قابو پا لے گی جو اس کو پیش کئے جا رہے ہیں۔ بے شک جب تک ہم اپنے گھر کو درست نہ کر لیں ان مبازرت طلبیوں سے عہدہ برا ہونے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ اس کے لئے مرکزی اسلامی تصورات کو صحیح طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ تصورات درج ذیل ہیں:-

ایمان

اللہ جل مجدہ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ ہم کلیتاً اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیں۔ جیسا کہ اللہ ذات سبحانہ مطلق العنان ہے اسے صرف مکمل وفاداری ہی قبول ہے۔ اس ذات مطلق کو 99.9 فی صد وفاداری بھی قابل قبول نہیں۔ اور اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہم اس کے محبوب ختم الرسلؐ کے ساتھ بھی مکمل طور پر وفادار ہوں۔ ہمیں کبھی بھی حضور سرور دو عالم کی ذات قدس کے بارے میں نعوذ باللہ کسی کی کا گمان تک بھی نہیں ہونا چاہیے جو کہ اسلام کے ہم تک پہنچنے کا ذریعہ فقط تھے۔ فخر دو عالم حضرت محمد مصطفیٰؐ سے وفاداری کا مطلب یہ ہے کہ ہم نہ صرف آپ کی ذات اقدس کو اللہ تعالیٰ کا آخری پیغمبر سمجھیں بلکہ انہیں اپنا روحانی اور سیاسی رہنمائے کل بھی گردانیں۔ یہ اس

لئے کہ حضور کے دین کامل کا مشن رہتی دنیا تک جاری وساری رہے گا۔

حضرت محمدؐ کے ساتھ وفاداری

اشارۃً رسالت مآبؐ سے وفاداری مطلق کی مشابہت جھنڈوں کی تصویر کشی سے ہو سکتی ہے۔ اگر آپ حضور سرور دو عالم کے وفادار متبع ہیں تو دنیا کے تمام جھنڈوں کو خیر باد کہہ کر صرف فخر دو عالمؐ کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔ جب آپ کو یہ توفیق ہو گی تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس کارزار جہان کو رسول اکرمؐ کے نقطہ نظر سے دیکھنے کی قابلیت ودیعت کرے گا۔ جب آپ اس دنیا کو حضور رسالت مآب کے نقطہ نظر سے دیکھنا شروع کریں گے تو آپ کے سارے ذاتی مفادات اور گروہی تنازعے ختم ہو جائیں گے۔ اور آپ کے قول و فعل کو اللہ تعالیٰ اور حضور سرور عالمؐ کی خوشنودی حاصل ہو گی اور آپ جو کچھ کریں گے اس میں کامیابی و کامرانی ہو گی کیونکہ اس حال میں آپ کا ارادہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے مطابق ہو جائے گا۔ بیشک اللہ تعالیٰ کا ارادہ کبھی ناکام نہیں ہو سکتا۔ اس حال میں آپ اسلامی دنیا کی بلکہ ساری دنیا کی فلاح کے لئے اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اور رحمت اللعالمین کے نمائندے بن جائیں گے۔ ایک ناقابل تنسیخ صورت میں حضور سرور دو عالمؐ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر ہر مسلمان ایک بار پھر سعد بن ابی وقاصؓ، طارق بن زیاد اور صلاح الدین ایوبی بن سکے گا۔ کامیابی اور کامرانی جو ایک عرصہ دراز سے ہمارے لئے مفقود ہے ہمارے قدم چومنے میں فخر محسوس کرے گی۔ یقین کیجئے یہی سادہ سی سچائی ہمارے "رازوں کا راز" ہے۔ جب تک ہم اسے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے تسلیم نہیں کرتے ہم کسی مقام کو نہیں پا سکیں گے۔ ہمیں جان لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت صرف اسی حالت میں پہنچے گی، جب تک ہم مکمل طور پر اس کے اور صرف اس کے نہ ہو جائیں۔ درحقیقت صرف وہی شخص مسلمان کہلانے کا مستحق ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کا کامل اتباع کرے۔

رخ میں تصحیح

اسلام کا ایک بنیادی تصور سمت کا ہے۔ اسی لئے ہمیں کرہ ارض پر قبلہ دیا گیا ہے۔ اگر ہماری نظریاتی جہت صحیح نہیں تو ہماری ساری کی ساری مذہبی کاوشیں بیکار ہو جائیں گی۔ اسلام کی جہت نہایت ہی جامع مذہب ہونے کی وجہ سے فلاح و بہبود کی طرف ہے نہ کہ نجات کی طرف۔

قرآن حکیم فقط قانون کے مآخذوں کی کتاب نہیں ہے یہ اللہ تعالیٰ کا پوری انسانیت کے لئے ایک کامل پیغام ہے جو کہ انسان کو اپنا روحانی رخ صحیح کرنے کے لئے شمع ہدایت ہے۔ صحیح روحانی جہت کے بغیر ہر ضابطہ قانون ایک خالی خول سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔

ایک صحیح جہت کا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف ہماری سوچ مخصوص مذہبی معاملات پر بلکہ وسیع تر سماجی اور سیاسی معاملات پر بھی صحیح ہو۔ مسلمانوں کا بنیادی مدعا اللہ تعالیٰ کے قوانین پر چل کر فلاح پانا ہے نہ صرف قانون کو قانون کی خاطر ماننا۔ اسلامی قانون انسان کی فلاح کے لئے ہے نا کہ انسان قانون کے لئے۔

دوسری طرف انسان کے خود ساختہ قوانین جو کہ ذاتی یا گروہی مفادات پر مبنی ہوتے ہیں کا منطقی نتیجہ تنازعات، ظلم اور استبداد ہے۔

اسلام ایک جامعہ راستہ

اسلام روحانیت اور قانون کا ایک حسین امتزاج ہے۔ موجودہ وقت کا سب سے بڑا سوال مسلمانوں کے لئے یہ ہے کہ اگر اللہ جل مجدہ کے قوانین اتنے ہی سیدھے اور صاف ہیں تو مسلمان ان کی پیروی کرنے کے قابل کیوں نہیں ہوتے۔ کیونکہ ظاہری طور پر متشرع مسلمان قرآن کے معاشی، سماجی اور سیاسی احکامات اپنانے میں ناکام رہتے ہیں۔ جواب صاف ظاہر ہے کہ جب تک روحانیت کے چشمے مردوں اور عورتوں کے دلوں میں نہیں پھوٹتے وہ اللہ تعالیٰ کے قوانین کو حقیقی طور پر اپنا نہیں سکیں گے اور بیرونی طور پر اسلامی قوانین کا نفاذ ایک کوشش خام ہوگی۔ دراصل اسی مشکل کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن حکیم اللہ کی یاد (ذکر اللہ) کو باقی مذہبی فرائض پر فوقیت دیتا ہے۔ بے شک اس دنیا اور آخرت میں سرخ رو ہونے کے لئے مسلمانوں کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ اپنے دین پر جامع طور پر قائم ہوں اور اس کی روحانیت اور قانون کا پورا پورا اتباع کریں۔ دراصل ہمارے بہت سے گروہی تنازعات کی وجہ یہ ہے کہ ہم اسلام کے جامع راستے کی بجائے اسکے جزوی راستوں کو اپنا لیتے ہیں۔ یہ ستم ظریفی ہے کہ جب بھی پاکستان میں اسلامی ضابطہ زندگی کے بارے میں سوال اٹھایا جاتا ہے تو گروہی مفادات اس کے اصلی رخ کو نظر انداز کر کے گفتگو کا رخ ہاتھوں کے کاٹنے اور سود کی طرف مبذول کرا دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ اچھی

طرح جانتے ہیں کہ ہاتھوں کا کاٹنا ایک غیر منصفانہ سوسائٹی میں جائز نہیں اور سود کا اخراج محض ایک طریقہ ہے دولت کو چند ہاتھوں میں جمع نہ ہونے دینے کا۔ کوئی معمولی ماہر اقتصادیات بھی آپ پر یہ بات واضح کر دے گا کہ پاکستان کے موجودہ اقتصادی اور سماجی ڈھانچے میں سود کو خارج کرنے کا مطلب امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بنانا ہوگا جو کہ یقیناً اسلام کے اصولوں کا تضاد ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے آخری پیغام ہونے کا مفہوم

اللہ جل مجدہ کا انسانیت کو قرآن مجید کی صورت میں فیصلہ کن پیغام کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس اسلام کے بارے میں کوئی انتخاب و اختیارات نہیں ہیں۔ اسلام قبول کرنے پر کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔ یہی اللہ تعالیٰ کی رضا کے سامنے سر جھکانے اور سیدنا محمدؐ کی اتباع کا ماحصل ہے۔ جب کوئی کلمہ شہادت پڑھتا ہے تو وہ پھر اپنے ارادہ کو بدلنے کا حق کھو دیتا ہے۔ درحقیقت اسی اصول کی اطاعت کے تحت مرتد کی سزا موت ہے۔ اور اس کا منطق یہ ہے کہ اگر واقعی ہم رسول اکرمؐ کو نبی آخرالزمان مانتے ہیں تو ان سے عہد وفا کو توڑ نہیں جا سکتا۔ اس لئے کوئی بھی مسلمان ملک کوئی آزادانہ طرز فکر اپنائے گا تو وہ کلیتاً ناکام ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی ہر کوشش کو خاک میں ملا دے گا۔

دوسرے مذاہب یا عقائد کے ماننے والوں کے لئے بے شک اختیار و انتخاب کے دروازے کھلے ہیں جن میں سے ایک دروازہ قبول اسلام کا بھی ہے۔ اگر ان کی راہ انتخاب غیر منصفانہ نہیں تو رحم کرنے والا خالق حقیقی ان کی کوششوں کو بار آور کرے گا۔ لیکن یہ رعایت مسلمانوں کے لئے نہیں ہے۔ ان کی ہر غیر اسلامی ترکیب شروع ہی سے بے نیل و مرام ہوگی۔ بالالفاظ دیگر جبکہ عیسائی، ہندو یا کوئی ملحد سوسائٹی بطور اشتراکی یا قوم پرست نظام حکومت کے تحت کامیاب ہو سکتی ہے۔ ایک اسلامی سوسائٹی غیر اسلامی نظام کو اپنا کے بری طرح ناکامی کا سامنا کرے گی خواہ اس کے ارادے کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔ یہ انسان کا نہیں اللہ جل مجدہ کا قانون ہے، آپ دیکھیں کہ پچھلے پچاس سالوں سے عرب معاشرہ نے سورج تلے اپنا مقام حاصل کرنے کے لئے کیا کیا کاوشیں نہیں کیں۔ کیا پر اثر و فصاحت، کیا کرشماتی قائدین، کیا رزمیہ شاعری اور کیا ذرائع انکے

پاس نہ تھے۔ مگر ان کے عرب اشراکیت اور عرب قومیت کے تحت منصوبہ جات اور کاوشیں بار بار ادھورے رہ کر خاک میں مل گئے۔ عرب ناکامی کے تمام واقعات میں اللہ تعالیٰ جل مجدہ کا ہاتھ صاف نظر آ رہا تھا۔ عرب قوم پرستی کے طویل ڈرامے کا آخری سین شتیلا اور صابرہ کیمپوں میں عیسائیوں کے ہاتھوں فلسطینیوں کا گھناؤنا قتل عام تھا اور اس پر ستم ظریفی یہ کہ اسرائیلی مناخم بگین نے یہ طعنہ دیا کہ دنیا والو دیکھ لو یہ ہم نہیں بلکہ عربوں نے اپنے عرب بھائیوں کو قتل کیا ہے۔ بے شک مسلمانوں کے پاس کوئی اختیار وانتخاب نہیں ماسوائے اس کے وہ اسلامی راستے پر گامزن ہوں نہ صرف ظاہری طور پر بلکہ حقیقی طور پر۔ میرے ذہن میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ ہمارا کوئی بھی غیر اسلامی منصوبہ کتنا ہی اچھا اور قابل عمل کیوں نہ ہو ماضی کی طرح مستقبل میں بھی ناکام ہو جائے گا۔ بہر حال اس کا یہ مطلب نہیں کوئی بھی جعلی منصوبہ اسلامی نام کے ساتھ کامیابی سے ہمکنار ہو سکے گا۔ ان تمام تحریکوں کا جو ذاتی، گروہی یا قومی مفاد پر مبنی ہیں منطقی نتیجہ الجھنوں اور تنازعات کے سوا کچھ نہیں۔ اسی طرح بہت سی اسلامی جماعتیں جو کہ اپنی اپنی قیادتوں کے ذاتی مفادات پر مبنی ہیں ماسوائے اس دنیا اور آخرت کی ذلت کے اور کچھ نہ حاصل کر سکیں گے۔ کسی بھی مسلمان ملک میں سیاسی تحریک صرف اللہ جل مجدہ کے لئے (فی سبیل اللہ) ہونی چاہیے۔

اسلام: مستقبل کا مذہب

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ چونکہ اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے اس لئے مستقبل کا مذہب ہے۔ اس لئے مسلمانوں کا کام صرف یہ تو نہیں کہ ماضی کو سینے سے لگا کر بیٹھے رہیں بلکہ ان کا کام تو یہ ہے کہ اسلام کی روح کو سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو مستقبل کی ناگہانی مبازرت طلبیوں کے لئے تیار رکھیں۔ بے شک قرآن مجید ہی اسلامی قوانین کا فیصلہ کن مآخذ ہے۔ اور حضور رسولؐ کی حیات طیبہ ایک زندہ وتابندہ قرآن کے مانند تھی۔ تاہم چونکہ قرآن پاک انسان کے لئے ایک فیصلہ کن پیغام ہے، اس لئے اس پر ایک مسلسل اجتہاد کی ضرورت ہے جسے پڑھے لکھے زعما کی حمایت حاصل ہوتا کہ اس کی روشنی میں ہر مکان وزمان کے لئے اسلامی قوانین بنائے جا سکیں۔ ماضی کے عظیم فقہاء کی قانونی تشریحات وتوضیحات بطور حوالہ جات کے پیش کی جا سکتی ہیں مگر انہیں ایک فیصلہ کن درجہ نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہ درجہ تو صرف قرآن حکیم کے لئے ہے۔ کسی اور چیز

کو یہ درجہ دینا تو بہت بڑا شرک ہوگا۔ بے شک اس قوم کی صداقت ہر سچے مسلمان کے لئے روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ مگر پھر بھی بہت سارے مسلمان اجتہاد کے دروازے کھولنے کی مخالفت کریں گے اس ڈر کے پیش نظر کہ اگر یہ راستے کھول دیئے گئے تو پھر دشمنان اسلام کے لئے بھی رستے کھل جائیں گے۔ تاہم میں انہیں یقین دہانی کراتا ہوں کہ انہیں اس قسم کا کوئی خوف نہیں ہونا چاہیے اور اس طرح اسلام کے چھپے ہوئے دشمن بھی آشکار ہو جائیں گے۔ بہر حال ہمیں آج کے خوف سے کل کی امیدوں پر پانی نہیں پھیرنا چاہیے۔

اگر ہم مسلمان واقعی اللہ تعالیٰ کی واحدنیت کو شعار بنا لیتے ہیں تو دنیا کو ہمارا ایک ہی چہرہ نظر آتا مگر ہم نے دنیا کو اتنے مختلف چہرے دکھائے ہیں کہ ہم اپنی متفقہ اسلامی جہت کھو بیٹھے ہیں۔ اگر چہ ہم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا بڑے زور شور سے اقرار کرتے ہیں مگر ہماری آستینوں میں بہت سے بت چھپے ہوئے ہیں۔ مسلم قومیت کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ اس کے پاس ذاتی فریب کاری کی بہت صلاحیت ہے۔ ہر گروہ شاید غیر ارادی طور پر اپنے اپنے مفادات اسلام کے مفادات کے ساتھ خلط ملط کرتا رہتا ہے۔ اسلام کا راستہ جو کہ صلح، انصاف، مساوات اور فلاح و بہبود کا راستہ ہے قرآن حکیم میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ اس کی ایک زندہ مثال حضور سرور دو عالمؐ کی حیات مبارکہ ہے، لیکن صرف صدق و اخلاص ہی ہمارے قرآنی مطالعہ کو فرقان (صحیح اور غلط کا معیار) کی طرف لے جا سکتا ہے۔ صدق اور اخلاص کے بغیر قرآن کریم ہمارے لئے پردہ بن جائے گا اور ہم ادھر ادھر بھٹکتے پھریں گے اور اپنی زندگیاں ایک ادھوری جستجو کے تعاقب میں ایک غیر کامل شے کو کامل تصور کرتے ہوئے ضائع کر دیں گے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہم پاکستان کو اسلام کا قلعہ اسی صورت میں بنا سکتے ہیں جب ہم سب بذات خود اسلام کے قلعے بن جائیں نہ صرف ظاہری طور پر بلکہ باطنی پور پر بھی، اپنے دلوں میں یہ یقین رکھتے ہوئے کہ آخری علم اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔

ماضی میں علمائے کرام کا کردار

(اور جدید دور میں ان کی ذمہ داریاں)

محمد موسیٰ بھٹو

ہمارے ہاں جدید تعلیم یافتہ افراد اور علماء کے درمیان ایک دیوار حائل ہوگئی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ جب تک دوری کی یہ دیوار دور نہ ہوگی تب تک اسلامی نظام کی سمت ہمارا سفر بہت دشوار ہوگا، اس لئے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کے بنیادی علم سے نا آشنا ہے۔ مذہبی علماء کے تعاون کے بغیر اسلامی نظام کی منزل سر نہیں ہوسکتی۔ آیئے اس موقعہ پر تفصیل کے ساتھ یہ جائزہ لیں کہ معاشرہ میں علماء کے مقام اور حیثیت کو کم کرنے میں غلط فہمیوں کو کتنا دخل حاصل ہے اور خود علماء سے وہ کیا کوتاہیاں سرزد ہوئیں جن کی وجہ سے وہ ملک کے حالات کی درستگی اور اسلام کی خدمت کے سلسلہ میں بھرپور کردار ادا نہ کر سکے۔

ہمارے ہاں جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ جس طرح یورپ میں پادریوں نے فلسفہ اور سائنس کو کفر قرار دیا تھا اسی طرح اسلامی دنیا میں بھی مذہبی طبقہ کی طرف سے ضرور سائنس کی مخالفت کی گئی ہوگی۔ جدید طبقہ کی مصیبت یہ ہے کہ یورپ سے مرعوبیت کی بنا پر وہ اس کی تاریخ کا تو مطالعہ کرتا ہے لیکن وہ اپنی تاریخ کے مطالعے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اس طبقہ کی دوسری مشکل یہ ہے کہ مذہب کے بارے میں اس کا جو بھی مطالعہ ہے وہ مغربی مصنفین اور مستشرقین کی کتابوں سے حاصل کردہ ہے۔ ظاہر ہے مغربی مصنفین نے اپنی کتابوں میں جس مذہب کا نقشہ کھینچا ہے وہ عیسائی مذہب ہے جسے پادریوں نے سائنس، ترقی اور ہر نئی چیز کا مخالف اور متصادم بنا دیا تھا۔ اس معاملہ میں اگر یورپ کے پادریوں اور اسلامی دنیا کے مذہبی طبقہ کے کردار کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ہمیں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ اس سلسلے میں ذرا پادریوں اور علمائے کرام کے کردار پر ایک نظر ڈالئے۔

یورپ میں علم و ادب سائنس و ترقی کے سلسلہ میں پادری کا جو کردار رہا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ یورپ نے ۱۴۷۸ء میں مجالس تفتیش و احتساب قائم کیں جس کا مقصد یہ تھا کہ علم و سائنس سے ذرا سی دلچسپی رکھنے والوں کو مجلس احتساب میں پیش کر کے سزائیں دی جائیں۔ اس محکمہ کی گرفت پوری طرح مضبوط کرنے کے لئے یورپ نے یہ حکم بھی جاری کیا کہ ہر

مسیحی روزانہ اپنے حلقے کے پادری کے سامنے اپنے اعمال اور خیالات کا حساب پیش کرے، جو شخص اس اعتراف میں سچائی کا ثبوت نہیں دے گا وہ مسیح کی برکتوں سے قطعی محروم اور دائمی جہنم کا مستحق بن جائے گا۔

اس حکم کا نتیجہ یہ نکلا بیوی شوہر کی، شوہر بیوی کا، باپ بیٹے کا اور بیٹا باپ کا مخالف اور جاسوس بن گیا۔ محکمہ احتساب کی سفاکیاں ملاحظہ ہوں کہ ۱۴۸۱ء سے ۱۸۰۸ء تک اس نے تین لاکھ ۴۰ ہزار آدمیوں کو مختلف عبرتناک سزائیں دیں۔ ان بدنصیبوں میں ۲۰ ہزار افراد ایسے تھے جنہیں زندہ جلا دیا گیا۔ اسپین کے محکمہ احتساب نے اپنی پہلی سالگرہ اس کارنامے سے منائی کہ بارہ مہینے میں دو ہزار آدمیوں کو زندہ جلایا اور ۱۷ ہزار آدمیوں کو بھاری جرمانے اور حبس دوام کی سزائیں دیں۔ پادری تارکوئی میڈا کٹیل اور لیاں کا صدر محتسب تھا اس شخص نے اپنے اٹھارہ سالہ دور احتساب میں ۱۰ ہزار دو سو بیس آدمیوں کو زندہ جلایا اور ۹۷ ہزار تین سو اکیس انسانوں کو بھیانک سزائیں دیں۔

معروف سائنسدانوں میں گلیلیو کو جیل میں اذیتیں دیکر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ گلیلیو نے عربوں کے علوم سے استفادہ کر کے دوربین کی ایجاد کا اعلان کیا اور ساتھ ہی زمین کے گول ہونے کا دعویٰ کیا۔ کلیسا نے ایسے گستاخانہ اعلان پر اسے گرفتار کر لیا۔ اسے خوفناک سزاؤں کی دھمکیاں دی گئیں۔ چنانچہ اس نے معافی مانگ کر رہائی حاصل کی لیکن تلاش و تحقیق کے جذبہ نے اسے خاموش رہنے نہیں دیا۔ ۱۶ سال کی خاموشی کے بعد اس نے اپنی کتاب "نظام عالم" شائع کر دی جس میں زمین کا گول ہونا ثابت کیا گیا۔ اس جرم میں اسے جیل بھیج دیا گیا اور وہاں اسے گھٹنوں کے بل کھڑا کیا گیا بالآخر وہ سسک سسک کر مر گیا۔

اٹلی کے علامہ برونو کو اس جرم میں پکڑا گیا کہ وہ متعدد دنیاؤں کا قائل تھا۔ عدالت احتساب نے اس وجہ سے اسے بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالنے کا فیصلہ صادر کیا، یہ حکم سن کر برونو نے عدالت کو ان الفاظ سے خطاب کیا۔ "یقین کرو تمہارا حکم سن کر میرے دل میں اس خوف کا عشر و عشیر بھی طاری نہیں ہوا جو خود تمہارے دلوں میں اسے صادر کرتے ہوئے پیدا ہوا ہوگا۔ ۱۶ فروری ۱۶۰۰ء میں اسے نذر آتش کیا گیا۔

کلیسا کے اس وحشیانہ طرز عمل کے خلاف لوتھر کی تحریک پروٹسٹنٹ نے جنم لیا۔ پادری تحریک

اصلاح کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ ان دونوں کے درمیان ۱۶۱۸ء سے ۱۶۴۸ء تک یعنی ۳۰ سال تک خونی معرکہ جاری رہا۔ اس معرکہ میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگاروں کے مطابق ۷ لاکھ افراد ہلاک ہوئے اور اربوں روپے کی جائیداد تباہ ہوئی۔ پروفیسر فشر اپنی کتاب "یورپ کی تاریخ" میں لکھتا ہے کہ اس جنگ میں زبردست لوٹ مار اور فاقہ کشی کے علاوہ آدم خوری کا بھی مظاہرہ ہوا۔ گاؤں کے گاؤں تباہ ہو گئے، اخلاقی ضابطے ٹوٹ گئے اور پورا ملک حیوانی شہوت پرستی کی نذر ہو کر رہ گیا۔

پادریوں کے اس کردار کے مقابلے میں ہمارے علماء کی پوری تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس سے معلوم ہو کہ علماء نے نئی نئی ایجاد کے علمبرداروں، سائنسدانوں اور ریاضی دانوں کو قابل گردن زنی قرار دیا ہو۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلم علماء کے اندر بڑے بڑے فلاسفر، تاریخ دان، حکماء اور ہر قسم کے علوم و فنون کے ماہر پیدا ہوئے ہیں۔ ابن عربی، ابن خلدون، ابن رشد، ابن ماجہ، غزالی، رازی، ابن تیمیہ، رومی، فارابی، کندی، بوعلی سینا، بیرونی، اور اس طرح کی شخصیتوں کی ایک پوری فہرست ہے جو ہماری مسلم تاریخ کا قیمتی ورثہ ہیں۔ یورپ میں علمی، عقلی اور سائنسی دور کا آغاز دراصل انہی ممتاز مسلم علماء کی کتابوں کے ترجمہ سے شروع ہوا۔ جس کا اعتراف خود مغربی مصنفین کرتے ہیں اس سلسلہ میں ہم یہاں مغربی مصنفین کے کچھ حوالے پیش کرتے ہیں۔

گسٹو ورکس نے صراحتہً اعتراف کیا ہے کہ یورپ سائنٹیفک انکشافات میں اسلام کا ممنون ہے، اسلام ہی کے طفیل علماء سائنس بیکن، نیوٹن وغیرہ پیدا ہوئے۔ اگر مسلمانوں نے کاغذ، بارود، قطب نما اور آلات کی ترقی کو رواج نہ دیا ہوتا تو یورپ کی سائنس و تہذیب کی چودہ سو برس پہلے جو حالت تھی وہی آج ہوتی۔

فرانسیسی لیبان اپنی کتاب "تمدن عرب" میں لکھتا ہے۔ "یورپ کی یونیورسٹیاں چھ سو برس تک عربی کتابوں کے تراجم پر زندہ ہیں۔ وہ عرب ہی ہیں جنہوں نے یورپ کو علم، اخلاق اور تہذیب کی راہیں دکھائیں، نظری علوم میں انہماک کے ساتھ عربوں نے ان علوم سے صنعت و حرفت میں بھی پورا کام لیا ان کے علوم نے صنعتوں کو درجہ کمال تک پہنچایا۔ ہم ان کے اکثر طریقوں سے واقف نہیں ہیں۔ لیکن ان طریقوں کے نتیجے ہمارے سامنے ہیں۔ مثلاً ہم جانتے

ہیں کہ وہ کانیں کھودتے اور ان سے گندھک، تانبہ، لوہا، چاندی، اور سونا نکالا کرتے تھے۔"

انگلش رائٹر ایچ جی ویلز اپنی کتاب "ہاٹ اوم آف مین" میں لکھتا ہے "اسلامی تمدن، مغربی تمدن کا پیش رو ہے۔ بصرہ، کوفہ، بغداد، قاہرہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیاں علم و حکمت کی مرکز تھیں اور پوری دنیا میں نور پھیلا رہی تھیں۔ یورپ میں عربی فلسفہ اسپین کی راہ سے داخل ہوا اور پیرس، آکسفورڈ اور شمالی اٹلی کی یونیورسٹیوں پر چھا گیا۔ اس عربی فلسفہ نے جس میں ابن رشد کو خاص اہمیت حاصل ہے یورپین ذہن کی کایا پلٹ دی۔ طب میں مسلمانوں نے جو ترقی کی یونان اس کی پاسنگ کو بھی نہیں پہنچا"

یہ حوالہ جات میں نے اس لئے پیش کئے ہیں تا کہ ہمارے جدید طبقہ کو معلوم ہو کہ علم و فلسفہ، سائنس و منطق کی راہ میں رکاوٹ مسلمانوں کا مذہبی طبقہ نہیں تھا بلکہ یہ "کارنامہ" پادریوں کا تھا۔ مسلمان علماء نے تو سائنس و ترقی کے دروازے کھولے ہیں اس حساب سے پادری رجعت پسند، تاریک پسند اور جمود پسند تھے جبکہ ہمارے علماء کرام روشن خیال اور ترقی پسند تھے۔

پھر یورپ میں پادریوں نے ملوکیت کے خلاف جنگ کرنا تو درکنار یہ فتویٰ دیا کہ بادشاہ خدا کا سایہ ہوتا ہے اور وہ معصوم اور منزہ عن الخطا ہوتا ہے جبکہ ہمارے ہاں اس سلسلہ میں علماء کا کردار شروع سے قابل قدر اور لائق تعریف رہا ہے ہمارے علماء نے محسوس کیا کہ مسلم معاشرہ کی علمی، عقلی، سائنسی اور معاشی بالادستی باقی نہ رہ سکے گی اگر ملوکیت کے اثرات کا ازالہ نہ کیا جائے چنانچہ اس مقصد کے لئے وہ بادشاہوں سے متصادم رہے۔ جیلوں میں گئے، مصائب برداشت کئے، پھانسیوں پر چڑھے لیکن ملوکیت سے مصالحت کے لئے تیار نہ ہوئے امام ابوحنیفہ سے لے کر شاہ ولی اللہ اور مجدد الف ثانی تک ممتاز علماء و مجددین نے اس معاملہ میں جو کردار ادا کیا ہے اس سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔

ہندوستان میں ماضی بعید میں علماء کرام نے جو کارنامے سرانجام دیئے ہیں چونکہ وہ ہمارے موضوع بحث سے خارج ہیں یہاں اس لئے انگریز کی آمد کے بعد پیدا شدہ حالات میں علمائے کرام کے کردار کی ایک جھلک پیش کی جاتی ہے۔

برصغیر ہند پر انگریز کے قبضہ بالخصوص ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد یہاں انگریز کی پالیسی یہ تھی کہ مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو عیسائی بنایا جائے یا کم از کم انہیں مسلمان نہ رہنے دیا

CamScanner

کرنے کی خاطر ہر قسم کی سہولتیں حاصل تھیں۔ایک پادری کی تنخواہ چیف کمشنر کے برابر تھی۔ان کی ماہانہ آمدنی کا اوسط یہ تھا۔

ایک لارڈ پادری، دو ہزار روپے ماہوار۔ ایک بڑا پادری، ایک ہزار روپے ماہوار۔ چھوٹا پادری، پانچ سو روپے ماہوار اگر کسی پادری کے ہاں کوئی لڑکا پیدا ہو جائے تو پیدا ہوتے ہی ۱۵۶ روپے ماہوار اگر لڑکی پیدا ہو تو ۲۵۰ روپے ماہوار دیا جاتا تھا۔

مسیحی لٹریچر چھاپنے کے لئے چھ سو سوسائٹیاں قائم کی گئیں ۱۸۷۹ء میں چرچ مشن سوسائٹی نے انگلینڈ سے ایک پریس منگوایا، اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے سات مزید پریس منگوائے گئے۔ پریس لگانے کے بعد ان سوسائٹیوں نے تین سال کے اندر اندر جو لٹریچر شائع کیا اس کی رپورٹ ملاحظہ ہو۔ ۱۸۷۲ء میں ۱۱۰۳۶۲ انجیلیں اور دعاؤں کی کتابیں تقسیم کیں گئیں ۱۸۷۳ء میں مختلف کتابوں کی یہ تعداد ۸۱۰۶۵ تک پہنچ گئی ۱۸۸۴ء میں مزید ۲۵۲۱۹ کتابیں تقسیم کی گئیں۔

یہ ساری کتابیں دین مسیح کی حقیقت ثابت کرنے سے متعلق تھیں اور ان میں اسلام پر اعتراضات اور حملے کئے گئے تھے۔ مثلاً (۱) قرآن مجید اصلی نہیں ہے اس میں تحریف کی گئی ہے (۲) قرآن میں کوئی نئی چیز نہیں ہے توریت اور زبور سے سرقہ (چوری) کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے یہودیوں کی خرافات ہے (۳) محمد ﷺ کی پیشگوئی کتب عتیق و جدید میں نہیں ہے (۴) قرآن مجید کی آیات ایک دوسرے کی مخالف اور متضاد ہیں اس لئے قرآن کلام الٰہی نہیں ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ پادریوں کی طرف سے ۱۶ رسالے بھی شائع ہوئے تھے۔ پادریوں نے اس پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مناظرہ بازی کا بھی سلسلہ شروع کر دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اگر عیسائیت کے سیلاب کا مقابلہ نہ کیا جاتا تو حکومت کی سرپرستی میں عیسائیت کی تحریک انتہائی فروغ پذیر ہوتی اور لاکھوں کروڑوں افراد کا دین و ایمان سلامت نہ رہتا۔ یہ علما کرام ہی تھے، جنہوں نے فروغ عیسائیت کے اس سیلاب کے سامنے بند باندھا۔ کتابوں کے جواب میں کتابیں لکھیں اور رسالوں کے مقابلے میں رسالے شائع کئے اور انگریزی اور عبرانی سیکھ کر براہ راست مذہب عیسائیت کا مطالعہ کیا اور پادریوں سے مناظرے کئے۔ علماء کی اس زبردست جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ پادریوں کو لاجواب اور رسوا ہو کر اپنے جارحانہ طریقہ کو تبدیل کرنا پڑا۔ (جاری ہے)

پروفیسر غازی احمد پاکستان

(سابق کرشن لال)

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

"پروفیسر غازی احمد ایم اے عربی (گولڈ میڈلسٹ) ایم اے علوم اسلامیہ (گولڈ میڈلسٹ) ایم او ایل (عربی) آنرز عربی (میڈلسٹ) فاضل درس نظامی، بی ایڈ سابق لیکچرار شعبہ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی، سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج بوچھال کلاں (ضلع جہلم) آج کل اپنے آپ کو تبلیغ دین کے لئے وقف کر چکے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے اپنے قبول اسلام کے مفصل حالات پر مشتمل ایک کتاب شائع کی ہے جو تاثر سے بھرپور اور بڑی ایمان پرور ہے۔"

میں 1922ء میں ضلع جہلم کے ایک دور افتادہ گاؤں میانی میں ایک ہندو خاندان میں پیدا ہوا۔ والدین نے نام کرشن لال رکھا۔ میرے خاندان کے تمام افراد سناتن دھرمی عقائد کے مالک تھے۔ شروع میں میں بھی انہیں نظریات کا پابند تھا۔ لیکن آٹھویں جماعت میں پہنچا تو میرا رجحان خود بخود دین اسلام کی طرف ہونے لگا۔ اسی زمانے میں میری ملاقات بوچھال کلاں کے ایک عالم دین مولانا عبدالرؤف صاحب سے ہوئی۔ انہوں نے متعدد نشستوں میں مجھ پر اسلام کی حقانیت واضح کی۔ میں ان کے مواعظ سے بہت متاثر ہوا۔ لیکن ابھی زمانہ بچپن کا تھا۔ اس لئے اپنے آبائی مذہب، اپنے خاندان، اپنے بہن بھائیوں اور خصوصاً والدین کو چھوڑنے کا خیال بھی میرے ننھے سے دل میں قیامت برپا کر دیتا۔ میرا معصوم سا ذہن ایسی سوچ ہی سے لرز جاتا تھا۔ چنانچہ جب بھی اسلام قبول کرنے کا سوال آتا، دل میں والدہ اور بھائیوں کی محبت کا بہاؤ تیز تر ہو جاتا۔ بچپن کی ناپختگی اور ناتجربہ کاری آڑے آتی اور میں کسی حتمی فیصلے پر نہ پہنچ پاتا۔

یکم مارچ 1938ء کی رات تھی جبکہ میں نے ایک سہانا اور مبارک خواب دیکھا۔ میں مکہ معظمہ میں بیت اللہ کے عین سامنے کھڑا ہوں۔ سید الاولین والآخرین حضرت محمدﷺ (فداروحی وابی و امی) دیوار کعبہ سے تکیہ لگائے میرے سامنے جلوہ افروز ہیں۔ اردگرد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تشریف فرما ہیں۔ میں والہانہ جذب و شوق کے عالم میں صحابہ کرامؓ کے درمیان سے گزرتا

ہوا سید الانبیاء کی بارگاہ اقدس میں پہنچتا ہوں۔ مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہوں تو آنحضرتؐ اٹھ کر میرا ہاتھ تھام لیتے ہیں۔ میرے بدن کے رگ و ریشے میں مسرت و شادمانی کی لہریں دوڑ جاتی ہیں۔ حضورؐ دریافت فرماتے ہیں "کہو کیسے آئے ہو""مشرف بہ اسلام ہونے کے لئے" میں عرض کرتا ہوں۔ یہ سن کر آنحضرتؐ کا روئے انور وفور مسرت سے چمک اٹھتا ہے۔ آپ میرا ہاتھ اپنے مقدس ہاتھوں میں تھام کر کچھ پڑھتے ہیں۔ جسے میں نہیں سمجھ سکا۔ پھر فرماتے ہیں "بس اب تم دولت اسلام سے بہرہ ور ہو گئے ہو"۔

حسب معمول صبح آنکھ کھلی تو میرا دل خوشی کے بے پایاں جذبات سے معمور تھا، چنانچہ جب والدہ محترمہ کے پاس بیٹھ کر کھانا کھانے لگا تو انہوں نے مجھ سے خلاف معمول اس قدر خوش خوش نظر آنے کی وجہ پوچھی۔ میں بات کو ٹال گیا۔

مدرسہ کے اوقات میں مولانا عبدالرؤف صاحب سے مل کر انہیں جب رات کا پرلطف خواب سنایا تو انہوں نے فرمایا روزانہ سوتے وقت اللہ سے راہ ہدایت کی دعا کیا کرو۔ میں ایسا ہی کرنے لگا۔ دو ہی دن گزرے تھے کہ 3 مارچ 1938ء جمعرات کی شب کو میں سو رہا تھا کہ خواب میں یوں محسوس ہوا جیسے مدرسہ بند ہونے پر میں میانی کے دیگر طلبہ کے ساتھ گھر آ رہا ہوں۔ راستے میں ایک قوی ہیکل، دیو قامت اور کریہ المنظر شخص کھڑا ہے جسے دیکھ کر ہم سب پر لرزہ طاری ہو گیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا یہ دجال ہے، ہم میں جس سے بھی یہ پوچھے کہ تم کس کے بندے ہو تو یہی جواب دے کہ میں خدا کا بندہ ہوں۔ پھر وہ میرے ساتھیوں سے فرداً فرداً سوال کرنے لگا جو طالب علم اس کی مرضی کے مطابق جواب دیتا اسے قسم قسم کے پھل، کھانے اور کھلونے دیتا اور جو اس کی بات نہ مانتا اس کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔

آخر میں جب میری باری آئی تو اس نے پوچھا" کس کے بندے ہو؟"

"اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں" میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

یہ سنتے ہی اس نے مجھے اس زور کا گھونسہ رسید کیا کہ میں کئی گز دور جا گرا اور رونے لگا۔ دجال نے تحکمانہ لہجے میں آواز دے کر کہا "ادھر آؤ" میں ڈرتا کانپتا ادھر چلا ہی تھا کہ میرے کانوں میں حضور نبی کریمؐ کی روح پرور آواز آئی "پہلے میرے پاس آؤ" آپ کو دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ

ابھی کل ہی تو میں نے انہیں مکہ مکرمہ میں دیکھا تھا، آج یہاں کیسے تشریف لے آئے" میں دجال کی سخت مار کی وجہ سے روتا ہوا آنحضرت ؐ کی بارگاہ عالی میں پہنچا۔ آپ ؐ نے میری کمر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے فرمایا" دیکھو! میں صرف تمہاری خاطر یہاں آیا ہوں۔ دجال کی بات ہرگز نہ ماننا۔ میں تمہارے لئے دعا کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تم ناکامی کا منہ نہیں دیکھو گے" یہ ارشاد فرما کر آپ ؐ تشریف لے گئے تو میں دجال کے پاس پہنچا۔ اس نے پھر وہی سوال دہرایا۔ میں نے بھی حسب سابق وہی جواب دے دیا۔ اس پر وہ مارے غصے کے لال پیلا ہو گیا۔ اور جھلا کر جب اس نے میرے منہ پر تھپڑ مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو مارے دہشت کے میری چیخ نکل گئی اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی، پھر میں صبح تک نہ سو سکا۔

میں نے پختہ فیصلہ کر لیا کہ آج بوچھال پہنچ کر قبول اسلام کا اعلان کر دوں گا۔ والدہ محترمہ نے حسب معمول جب صبح کو کھانا تیار کیا اور میں ان کے پاس بیٹھ کر کھانے لگا تو جذبات میں تلاطم برپا تھا۔ جانتا تھا کہ آج آخری مرتبہ ماں کے گھٹنوں کے پاس بیٹھ کر کھانا کھا رہا ہوں اور والدین اور بھائیوں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہوں۔ آج کے بعد اس گھر میں جہاں زندگی کی بہت سی بہاریں گزری ہیں شاید ہی کبھی قدم رکھنا نصیب ہو۔ میں نے بہانے سے پیاری ماں کے قدم چھو کر ہدیہ عقیدت واحترام پیش کیا اور بستہ اٹھا کر اپنے گھر پر، تین بھائیوں اور ماں پر حسرت بھری نگاہ ڈالی اور پرنم آنکھوں سے شہر کی راہ لی۔ 4 مارچ 1938ء کو جمعہ کا مبارک دن تھا اور محرم کی پہلی تاریخ تھی، جب میں نے غسل کیا اور سیدھا مسجد میں جا کر مولانا عبدالرؤف صاحب کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ میرا اسلامی نام غازی احمد تجویز ہوا۔

میرے اسلام لانے کی اطلاع جب گھر پہنچی تو کہرام سا مچ گیا۔ سب نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ والد صاحب کشمیر میں ملازم تھے، انہیں اور دوسرے رشتہ داروں کو بذریعہ تار مطلع کیا گیا۔ چنانچہ تین چار دن کے اندر ہی اندر میرے والد اور رشتہ داروں نے مولانا عبدالرؤف اور سکول کے ہیڈ ماسٹر ملک محمد طفیل پر مقدمہ دائر کر دیا کہ انہوں نے ہمارے نابالغ بچے کو ورغلا کر زبردستی مسلمان بنا لیا ہے۔ ایس ڈی ایم کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ ایک طرف والد محترم اور متعدد ہندو رشتہ دار تھے۔ دوسری طرف میں اور ہزاروں مسلمان۔ عدالت میں میرے بیان ہوئے،

میں نے بتایا کہ برضا و رغبت مسلمان ہوا ہوں۔ میرے قبول اسلام میں کسی فرد بشر کا ہاتھ نہیں، میں مسلمانوں کے پاس ہی رہوں گا۔ والدین کے پاس مجھے جان کا خطرہ ہے، عدالت نے فیصلہ میرے حق میں دے دیا۔ مسلمان خوشی سے نعرے لگانے لگے۔ میں شاداں و فرحاں ان کے ساتھ واپس آ گیا۔

میرے والد بھلا کب نچلے بیٹھنے والے تھے۔ انہوں نے مختلف عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر انہوں نے سیشن جج جہلم کی طرف رجوع کیا۔ وہاں پیشی ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ جج صاحب کا رویہ میرے خلاف ہے۔ میرا خدشہ درست ثابت ہوا اور مجھے دوسری پیشی تک والدین کے حوالے کر دیا گیا۔ میں نے جانے سے انکار کیا مگر مجھے زبردستی کار میں بٹھا دیا گیا اور دریا کے کنارے ایک مندر میں لایا گیا۔ والدہ بھی وہیں آ گئیں۔ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر میں اپنی روش سے باز نہ آیا تو وہ دریا میں کود کر جان گنوا دیں گی۔ دوسرے ہندو بھی طرح طرح کے لالچ دیتے تھے۔

اسی اثناء میں والد صاحب نے مل ملا کر ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر جہلم سے میرے نابالغ ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا اور اسی کی بنیاد پر سیشن جج نے میرے والد کے حق میں فیصلہ دے کر مجھے ان کے حوالے کر دیا۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ یہ جج مسلمان تھا۔ والد صاحب بتایا کرتے کہ انہوں نے جج کو رشوت دے کر فیصلہ اپنے حق میں کرایا تھا۔

فیصلے کے دن ہی والد صاحب مجھے ساتھ لے کر کشمیر روانہ ہو گئے۔ راستے میں جموں اور بٹوت ٹھہرتے ہوئے چوتھے دن ہم بھدرواہ پہنچ گئے۔ وہاں پہنچنے کے دوسرے ہی دن والد صاحب مجھے ایک پنڈت کی معیت میں گاؤں سے باہر ایک بلند پہاڑی پر لے گئے اور رو رو کر مجھے "راہ راست" پر لانے کی کوشش کرنے لگے۔ انہوں نے کہا میں اس مقدمہ میں دس ہزار روپیہ خرچ کر چکا ہوں۔ میری عزت خاک میں مل گئی ہے، میں خاندان میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا وغیرہ۔ میرا دل پسیج گیا، مگر رحمت ایزدی نے سہارا دیا اور حضور نبی اکرمؐ کی زیارت کے تمام مناظر میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ میں نے ادب سے جواب دیا۔

"مجھے آپ کی ساری پریشانی کا خوب احساس ہے، مگر میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میں

CamScanner

اب ترک اسلام کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اگر آپ مجھے اسلام پر قائم رہنے کی بخوشی اجازت دے دیں تو میں زندگی بھر آپ کا غلام رہوں گا"

یہ سنتے ہی والد صاحب غضب میں آ گئے۔ انہوں نے چھڑی اٹھائی اور مجھے نہایت بے رحمی سے پیٹنے لگے۔ یہ مار اتنی شدید تھی کہ بدن کے ہر حصے سے خون بہنے لگا۔ میں تڑپ تڑپ جاتا تھا مگر والد کو رحم نہ آتا تھا۔ وہ پورے زور سے بے تحاشا مجھے ضربیں لگا رہے تھے۔ بالآخر تھک گئے تو پنڈت سے کہنے لگے " کیوں نہ میں اسے دریا میں دھکیل دوں شاید اس طرح یہ کلنک کا ٹیکہ میرے ماتھے سے اتر جائے" پہاڑی کے دامن میں بھپرتا ہوا دریا میرے سامنے تھا۔ موت کے خوف سے میں لرز گیا۔ مگر لاکھ لاکھ شکر ہے اللہ تعالیٰ کا کہ میرے قدموں میں لغزش نہ آنے دی۔ میرے دل میں یہ خیال آنے لگا کہ والد نے مجھے دریا میں پھینکا تو میں اپنے پیارے نبی ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہو کر عرض کروں گا۔ میرے آقا! آپ نے مجھے اسلام کی جو دولت بخشی میں اس کو صحیح وسالم لے کر حاضر ہو گیا ہوں۔

چھڑی کی مار اور بوٹوں کی ان گنت ٹھوکروں سے جسم کا رواں رواں زخمی تھا۔ حتیٰ کہ ناک، منہ اور آنکھیں بھی متورم تھیں۔ تقریباً ہفتہ بھر بستر پر ہی دراز رہا۔ والد خود ہی مرہم پٹی کرتے رہے۔ حالت کچھ سنبھلی تو انہوں نے مجھے بھدرواہ ہائی سکول میں داخل کرا دیا۔ میں ہندو لڑکوں کی نگرانی میں سکول آنے جانے لگا۔ مسلمان طلبہ کو مجھ سے بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ہندو لڑکے اور استاد مجھے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتے۔ یہ سکول میرے لیے جہنم سے کم اذیت ناک نہ تھا۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد میں نے ایک مسلمان لڑکے دوست محمد سے تعلقات بڑھائے اور اس کے توسط سے مولانا عبدالرؤف کو خط لکھا۔ خط ملتے ہی مولانا نے قصبے کے لوگوں کو جمع کیا اور پوچھا" کوئی ہے جو جان پر کھیل کر ایک مسلمان کو کافروں کے چنگل سے چھٹکارا دلائے "اس پر ایک غریب لیکن باغیرت شخص اٹھا اور اس نے اپنی خدمات پیش کر دیں، اس کا نام جان محمد تھا۔

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق جان محمد صاحب ایک روز سکول کے اوقات ہی میں بھدرواہ پہنچ گئے، دوست محمد نے مجھے آگاہ کیا تو میں تفریح کے بعد روتا روتا اپنے ماسٹر صاحب

کے پاس پہنچا اور شدید پیٹ درد کا بہانہ کیا۔ ماسٹر صاحب نے مجھے چھٹی دے دی۔ میں نے بستہ سنبھالا اور آنکھ بچا کر سکول سے نکل آیا۔

جان محمد صاحب نے ایک مقامی مسلمان راہبر کو ساتھ لیا اور ہم بھدرواہ سے بھاگ کر راتوں رات کشمیر کی سرحد پار کر کے ریاست چنبہ میں آ گئے۔ مسلمان راہبر واپس چلا گیا اور ہم دونوں تقریباً ساٹھ میل کا سفر طے کر کے تیسرے دن ڈلہوزی پہنچے۔ سفر سے برا حال تھا۔ پاؤں متورم تھے اور کپڑے میلے چیکٹ۔

شام کو ہم براستہ پٹھان کوٹ امرتسر پہنچے۔ میں نے لباس تبدیل کیا اور کھیوڑہ کی راہ بوچھال کلاں پہنچ گیا۔ لاری اڈہ پر ایک ہجوم پذیرائی کے لئے موجود تھا۔

1941ء میں میٹرک کا امتحان میں نے سکول میں اول رہ کر امتیازی حثیت سے پاس کر لیا۔ اس کے بعد میں نے علوم دینیہ کی طرف توجہ دی چنانچہ 1943ء سے 1948ء تک میں نے مدرسہ خادم الشریعیہ پنڈی گھیپ، مدرسہ عربیہ اشاعت القرآن گجرات اور دارالعوم دیوبند سے دینی علوم کی تکمیل کی۔ 1948ء میں مولوی فاضل کا امتحان دیا اور صوبے بھر میں اول رہا۔ میرا ایمان ہے کہ یہ ساری کامرانیاں آنحضورؐ کی دعا کا نتیجہ ہیں۔ 1947ء میں میرے والدین اور بھائی بہن ہندوستان چلے گئے تو میں اپنے آبائی مکان میں منتقل ہو گیا۔ 1948ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں لیکچرار بنا۔ 1962ء میں شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی میں کام کرتا رہا اور اب گونمنٹ کالج بوچھال کلاں ضلع جہلم میں تدریسی فرائض انجام دے رہا ہوں۔

اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے اپنے اندر بہت بڑا ذہنی اور روحانی انقلاب محسوس کیا ورنہ اس سے پہلے میں متوسط ذہن کا مالک تھا۔ اسلام کے سایہ عاطفت میں آنے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے مجھ پر دینی و دنیاوی ترقی کے دروازے کھول دیئے۔ میں نے نبی اکرمؐ کی دعا کا اثر عملی طور پر یوں محسوس کیا ہے کہ آج تک کسی امر میں مجھے ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ آپ کی دعا میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ انشاء اللہ قیامت کے دن بھی یہی دعا میری نجات کا باعث بنے گی۔

CamScanner

چھوٹا منہ بڑی بات

سلسلہ اویسیہ

قدرت اللہ شہابؒ

مجھے یقین تھا کہ میرے آس پاس اور اردگرد بہت سے ایسے بزرگان دین اور پیر طریقت موجود ہونگے جنہیں میرا مرشد بننے کا حق حاصل تھا۔ لیکن مرید کے طور پر اپنے شیخ کے سامنے بلا سوال جواب مکمل ذہنی اطاعت قبول کرنے کی جو شرط لازم تھی۔ اسے نبھانا میرے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لئے میں نے تلاش شیخ کے لئے کوئی خاص کوشش نہ کی۔ بلکہ اپنی نگاہ سلسلہ اویسیہ پر رکھی جس کے بارے میں بہت سے بزرگان سلف کی تصنیفات میں چھوٹے چھوٹے اشارے ملتے تھے۔ لیکن یہ کہیں درج نہ تھا کہ اس سلسلہ میں قدم رکھنے کے لئے کونسا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے اور نہ یہ معلوم تھا کہ اس میں داخل ہونے کے کیا کیا قواعد وضوابط اور آداب ہیں لیکن ایک بار پھر یونہی بیٹھے بٹھائے خوش قسمتی کی لاٹری میرے نام نکل آئی۔

ایک بار میں کسی دور دراز علاقے میں گیا ہوا تھا۔ وہاں پر ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک بوسیدہ سی مسجد تھی۔ میں جمعہ کی نماز پڑھنے اس مسجد میں گیا، تو ایک نیم خواندہ سے مولوی صاحب اردو میں بے حد طویل خطبہ دے رہے تھے۔ ان کا خطبہ گزرے ہوئے زمانوں کی عجیب وغریب داستانوں سے اٹا اٹ بھرا ہوا تھا۔ کسی کہانی پر ہنسنے کو جی چاہتا تھا، کسی پر حیرت ہوتی تھی۔ لیکن انہوں نے ایک دستان کچھ ایسے انداز سے سنائی کہ تھوڑی سی رقت طاری کر کے وہ سیدھی میرے دل میں اتر گئی۔ یہ قصہ ایک باپ اور بیٹی کی باہمی محبت واحترام کا تھا۔ باپ حضرت محمدؐ تھے اور بیٹی حضرت بی بی فاطمہ تھیں۔ مولوی صاحب بتا رہے تھے کہ حضور رسول کریمؐ جب اپنے صحابہ کرامؓ کی کوئی درخواست یا فرمائش منظور نہ فرماتے تھے۔ تو بڑے بڑے برگزیدہ صحابہ کرامؓ بی بی فاطمہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی منت کرتے تھے کہ وہ ان کی درخواست حضورؐ کی خدمت میں لے جائیں اور ا سے منظور کروالائیں۔ حضور نبی کریمؐ کے دل میں بیٹی کا اتنا پیار تھا کہ اکثر اوقات جب بی بی فاطمہؓ ایسی کوئی درخواست یا فرمائش لے کر حاضر خدمت ہوتی تھیں تو حضورؐ خوش دلی سے اسے منظور فرما لیتے تھے۔ اس کہانی کو قبول کرنے کے لئے میرا دل بے اختیار آمادہ ہو گیا۔

جمعہ کی نماز کے بعد میں اسی بوسیدہ سی مسجد میں بیٹھ کر نوافل پڑھتا رہا، کچھ نفل میں نے حضرت بی بی فاطمہؓ کی روح مبارک کو ایصال ثواب کی نیت سے پڑھے۔ پھر میں نے پوری یکسوئی

سے گڑگڑا کر یہ دعا مانگی: "یا اللہ میں نہیں جانتا کہ یہ داستان صحیح ہے یا غلط لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تیرے آخری رسولؐ کے دل میں اپنی بیٹی خاتون جنت کے لئے اس سے بھی زیادہ محبت اور عزت کا جذبہ موجزن ہوگا۔ اس لئے میں اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ حضرت بی بی فاطمہؓ کی روح طیبہ کو اجازت مرحمت فرمائیں کہ وہ میری ایک درخواست اپنے والد گرامیؐ کے حضور میں پیش کر کے منظور کروالیں۔ درخواست یہ ہے کہ میں اللہ کی راہ کا متلاشی ہوں۔ سیدھے سادھے مروجہ راستوں پر چلنے کی سکت نہیں رکھتا۔ اگر سلسلہ اویسیہ واقعی افسانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے تو اللہ کی اجازت سے مجھے اس سلسلہ سے استفادہ کرنے کی ترکیب اور توفیق عطا فرمائی جائے"

اس بات کا میں نے اپنے گھر میں یا باہر کسی سے ذکر تک نہیں کیا۔ چھ سات ہفتے گزر گئے اور میں اس واقعہ کو بھول بھال گیا۔ پھر اچانک سات سمندر پار کی میری ایک جرمن بھابی کا ایک عجیب خط موصول ہوا۔ وہ مشرف بہ اسلام ہو چکی تھیں۔ اور نہایت اعلیٰ درجہ کی پابند صوم وصلوٰۃ خاتون تھیں۔ انہوں نے لکھا تھا:

The other night I had the good fortune to see "Fatimah" daughter of the Holy Prophet (Peace be upon him) in my dream. She talked to me most graciously and said, "Tell your brother-in-law Qudrat Ullah Shahab, that I have submitted his request to my exalted Father who has very kindly accepted it".

"اگلی رات میں نے خوش قسمتی سے فاطمہؓ بنت رسول اللہؐ کو خواب میں دیکھا انہوں نے میرے ساتھ نہایت تواضع اور شفقت سے باتیں کیں۔ اور فرمایا کہ اپنے دیور قدرت اللہ شہاب کو بتادو کہ میں نے اس کی درخواست اپنے برگزیدہ والد گرامیؐ کی خدمت میں پیش کر دی تھی۔ انہوں نے از راہ نوازش اسے منظور فرمالیا ہے۔"

یہ خط پڑھتے ہی میرے ہوش وحواس پر خوشی اور حیرت کی دیوانگی سی طاری ہوگئی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ میرے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے بلکہ ہوا میں چل رہے ہیں۔ یہ تصور کہ اس برگزیدہ محفل میں ان باپ بیٹی کے درمیان میرا ذکر ہوا۔ میرے روئیں روئیں پر ایک تیز وتند نشے کی طرح چھا جاتا تھا۔ کیسا عظیم باپؐ! اور کیسی عظیم بیٹی! دو تین دن میں اپنے کمرے میں بند ہو کر

دیوانوں کی طرح اس مصرعہ کی مجسم صورت بنا بیٹھا رہا۔ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ملاقات مجھ سے بہتر ذکر میرا ہے کہ اس محفل میں ہے!

اس کے بعد کچھ عرصہ تک مجھے خواب میں طرح طرح کی بزرگ صورت ہستیاں نظر آتی رہیں جن کو نہ تو میں پہچانتا تھا، نہ ان کی باتیں سمجھ میں آتی تھیں اور نہ ہی ان کے ساتھ میرا دل بھیگتا تھا۔ پھر ایک خواب میں مجھے ایک نہایت دلنواز اور صاحب جمال بزرگ نظر آئے جو احرام پہنے ایک عجیب سرور اور مستی کے عالم میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے۔ میرا دل بے اختیار ان کے قدموں میں بچھ گیا۔ وہ بھی مسکراتے ہوئے میری جانب آئے اور مطاف سے باہر حطیم کی جانب ایک جگہ مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔ اور بولے "میرا نام قطب الدین بختیار کاکی ہے۔ تم اس راہ کے آدمی تو نہیں ہو لیکن جس دربار گہربار سے تمہیں منظوری حاصل ہوئی ہے، اس کے سامنے ہم سب کا سر تسلیم خم ہے۔"

قطب الدین بختیار کاکی صاحب نے ایک پیالہ ہمارے درمیان رکھا، جس میں کھانے یا پینے کی کوئی چیز پڑی تھی۔ انہوں نے اچانک فرمایا۔ "تم یہ زندگی چاہتے ہو یا وہ زندگی؟" خواب میں بھی میرے دل کا چور انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا اور اس نے مجھے گمراہ کیا کہ غالباً اس سوال میں فوری طور پر موت قبول کرنے کی دعوت ہے یعنی دنیاوی زندگی چاہتے ہو یا آخرت کی زندگی۔ مجھے ابھی زندہ رہنے کا لالچ تھا۔ اس لئے میں اپنے دل کے چور کی پیدا کی ہوئی بدگمانی کا شکار ہو گیا۔ "حضرت کچھ یہ زندگی چاہتا ہوں، کچھ وہ۔"

میرا یہ کہنا تھا کہ میرے بائیں پہلو کی جانب سے ایک کالے رنگ کا کتا سا جھپٹتا ہوا آیا اور آتے ہی سامنے پڑے ہوئے پیالے میں منہ ڈال دیا۔

قطب صاحب مسکرائے اور بولے، "افسوس یہ مفت کی نعمت تمہارے مقدر میں نہیں۔ تمہارا نفس تو تم پر بری طرح غالب ہے اس لئے مجاہدہ کرنا ہوگا۔"

اس کے بعد کئی ماہ تک نہ کوئی خواب آیا اور نہ ہی کسی قسم کا واقعہ رونما ہوا۔ یہ تمام عرصہ میرے لئے ایک طرح سے عالم نزع کا سا زمانہ تھا۔ دل اور دماغ میں احساس محرومی کے پرنالے بہنے لگے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں سب کچھ حاصل کر کے اچانک سب کچھ کھو بیٹھا ہوں۔ بار بار خودکشی کرنے کا خیال آتا تھا۔ ایک بار میں نے ڈوب کر خودکشی کا منصوبہ بھی بنالیا۔ نہر میں چھلانگ لگانے کے لئے پل کی منڈھیر پر جا بیٹھا۔ غالباً جذبہ جھوٹا تھا اس لئے بیٹھے کا بیٹھا ہی رہ

گیا۔ اور چند گھنٹے بعد زندہ سلامت گھر واپس آ گیا۔

نائنٹی کا خط

اسی عالم یاس واضطراب میں تین سوا تین ماہ گزر گئے، جو میرے باطنی وجود پر تین صدیوں کی طرح بھاری گزرے۔ اس کے بعد اچانک 9 جون کا مبارک دن طلوع ہوا یہ دن میری زندگی کے دو یا تین اہم ترین ایام میں سے ہے۔ اس روز مجھے اچانک "نائنٹی Ninety" کا پہلا خط موصول ہوا۔ میں اسے فقط اسی کوڈ نام سے جانتا ہوں۔ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ اور کہاں ہے؟ ہماری خط وکتابت بذریعہ ڈاک فقط ایک بار ہوئی ہے۔ صرف اس کا پہلا خط بذریعہ ڈاک آیا تھا۔ لفافے پر ڈاک خانے کی جو مہر لگی ہوئی تھی۔ وہ یوں تھی۔ "(June 9, Jammu Market 9:30 a.m) ڈاکیہ اسی روز دن کے ساڑھے بارہ بجے یہ خط ڈیلیور کر گیا تھا۔ شہر کے پوسٹل نظام میں ایسا ممکن ہی نہ تھا، کہ صبح ساڑھے نو بجے کا پوسٹ کیا ہوا خط اسی روز دوپہر کے ساڑھے بارہ بجے مل بھی جائے۔

تیرہ صفحات پر مشتمل اس خط میں میرے ظاہر اور باطن کی ایسی ایسی باریک ترین خامیوں، کوتاہیوں، خرابیوں اور کمزوریوں کو اس قدر تفصیل اور وضاحت سے بیان کیا گیا تھا، جن میں سے بعض کا علم مجھے اور صرف میرے خدا کے علاوہ کسی کو نہ تھا۔ اور بعض کا مجھے خود بھی پورا علم نہ تھا۔ یہ خط اس طرز کی فصیح و بلیغ اور دقیق انگریزی زبان میں لکھا ہوا تھا کہ اسے سمجھنے کے لئے مجھے بار بار ڈکشنری کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ نصف خط اس تجزیے پر مشتمل تھا۔ اور باقی کا نصف احکامات، ہدایات اور مستقبل کے لائحہ عمل سے پر تھا۔ آخر میں لکھنے والے کے نام کی جگہ فقط یہ درج تھا۔

"A ninety years young fakir"

"یعنی ایک نوے سالہ جوان فقیر"

اس خط میں ایک حکم یہ تھا کہ چند سوالات جو اس میں اٹھائے گئے تھے۔ ان کا مکمل جواب انگریزی میں لکھ کر اسے اپنی کتابوں والی الماری کے کسی خانے میں رکھ دوں۔ میں نے فوراً تعمیل حکم کر دی۔ چند لمحوں کے بعد الماری کے پٹ کھولے تو میرا لکھا ہوا خط وہاں سے غائب تھا۔ اس خط کا جو جواب آیا۔ وہ اسی شب میرے تکیے کے نیچے پڑا ہوا ملا۔ جواب کے آخر میں "ایک نوے سالہ جوان فقیر" کی جگہ فقط ایک لفظ (Ninety) نوے درج تھا۔ اس حیرت ناک واقعہ سے میرے تن بدن پر شدید ہیبت اور گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ کچھ عرصہ مجھ پر نیم بے ہوشی کا سا عالم

طاری رہا۔ میری بے بسی اور بے کسی پر ترس کھا کر "نائنٹی" نے آئندہ سے میرے چھوٹے بھائی حبیب اللہ شہاب کو بھی میرا رفیق کار بنا دیا۔ حبیب کی رفاقت میرے لئے سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی۔

اس کے بعد کم وبیش پچیس برس تک ہمارے درمیان اس عجیب وغریب خط وکتابت کا سلسلہ قریباً قریباً روزانہ جاری رہا۔ بعض اوقات ہمارے درمیان خطوط کی آمد ورفت دن اور رات کے دوران دو دو، تین تین یا چار چار بار تک پہنچ جاتی تھی۔ حبیب ہمارا پوسٹ آفس تھا۔ ہمارا لیٹر بکس کبھی الماری ہوتی تھی، کبھی اپنی جیب، کبھی کوئی کتاب یا کاپی، یا کبھی یونہی سر راہ چلتے چلتے "نائنٹی" کے تحریر کردہ خطوط ہوا کے دوش پر سوار پھول کی پتیوں کی طرح سر پر آ لگتے تھے۔

حکم تھا کہ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہر تحریر کو جلد از جلد تلف کر دیا جائے۔ البتہ اتنی اجازت ضرور تھی کہ اس کے احکامات اور اس کی ہدایات کو اپنے طور پر اپنے الفاظ میں اس طور پر بے شک محفوظ کرلوں کہ اگر یہ کاغذات کسی اور کے ہاتھ لگ جائیں، تو یہ سب باتیں محض پراگندہ خیالی اور بے معنی رطب ویابس نظر آئیں۔ فقط ایک بار چھوڑ کر میں اس حکم کو بھی پوری پوری پابندی سے بجا لاتا رہا۔ ایک روز میرے دل میں لالچ آیا کہ میں اپنے گمنام اور نادیدہ خضر راہ کا کم از کم ایک دستخط Ninety اس کے کسی خط سے پھاڑ کر نشانی اور برکت کے طور پر اپنے پاس محفوظ کرلوں۔ یہ خیال آنا تھا کہ سزا کا تازیانہ فوراً نازل ہوگیا۔ رات کا وقت تھا بجلی کے بلب کے اردگرد چند پروانے منڈلا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں پر ایک کاغذ منڈلانے لگا۔ اور آہستہ آہستہ بل کھاتا ہوا نیچے میری گود میں آ گرا۔ اس میں تحریر تھا کہ حکم عدولی کا یہ منصوبہ فوری سزا کا مستحق ہے۔ سزا یہ تجویز ہوئی کہ بتیاں چند لمحوں کے بعد اپنے آپ گل ہو جائیں گی اور میرے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں نصف گھنٹہ تک ایک ایک زندہ سانپ سے باندھ کر رکھے جائیں گے۔ اس خوفناک سزا کا فیصلہ سن کر میں بے اختیار رو پڑا میں نے جلدی جلدی اپنے ارادہ سے توبہ کی۔ دل کی گہرائیوں سے معافی مانگی اور غالب کا یہ شعر انگریزی ترجمے کے ساتھ لکھ کر الماری میں رکھ دیا۔

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گنہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

دیکھتے ہی دیکھتے بجلی کے بلب کی جانب سے "نائنٹی" کا جواب لہراتا ہوا میرے ہاتھ میں آیا جس میں تحریر تھا۔ "ہاہاہا"۔ بس دو زندہ سانپوں کے تصور سے ڈر گئے۔ بزدل ہو۔ چلو معاف

کیا۔ لیکن یہ بات ہرگز نہ بھولو، کہ قبر میں دیگر حشرات الارض کے علاوہ زندہ سانپ بھی موجود ہونگے۔ وہاں پر نہ توبہ کرنے کا وقت ہوگا، اور نہ ہی توبہ قبول ہوگی۔ او غافل بندے، تجھے کیا معلوم کہ دن رات تمہارے بدن اور باطن کے ساتھ کتنے خوفناک اژدہے زبانیں نکال نکال کر لپٹے رہتے ہیں۔ اور وقت آنے پر زیر زمین کتنے اژدہے بے تابی سے تمہارا انتظار کررہے ہیں۔ کاش کہ تم لوگ جانتے۔ "تائیٹی"

ایک روز میں نے اپنے رہنما سے دریافت کیا۔ "آپ کون ہیں؟ کہاں ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ اور روحانیت کے کس مقام پر فائز ہیں؟"

جواب ملا! "پہلے تین سوال فضول ہیں۔ ان کا جواب تمہیں کبھی نہیں ملے گا۔ باقی رہی روحانیت کے مقام کی بات۔ اس طویل راستے پر کہیں کہیں گھاٹیاں اور کہیں کہیں سنگ میل آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ منزل یا مقام کا کسی کو علم نہیں۔ اس سڑک پر سب راہی ہیں۔ کوئی آگے کوئی پیچھے۔ منزل صرف ایک بشر کو ملی ہے۔ جس کے بعد اور کوئی مقام نہیں اس بشر کا نام محمدؐ ہے۔ تم اس کا نام رٹتے تو بہت ہو لیکن کیا کبھی اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش بھی کی ہے؟ اگر ایسا کرتے تو آج ایک کچی دیوار پر گوبر کے اپلے کی مانند چسپاں نہ ہوتے جس پر مکھیاں تک بھنبھنانا چھوڑ دیتی ہیں۔"

یہی میرا سلسلہ اویسیہ تھا۔ جس کی راہنمائی میں اس گنہگار نے راہ سلوک پر چند قدم ڈگمگانے کی سعادت حاصل کی۔ ڈگمگانے کا لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ کیونکہ جہاں کہیں کسی باطنی نعمت کا پیالہ نزدیک آتا تھا، میرے نفس کا کالا چور فوراً دم ہلاتا ہوا جھپٹ کر اس میں منہ ڈال دیتا تھا۔ اس کوشش ناتمام کو بھی میں اپنی [illegible] کا ایک اثاثہ ہی شمار کرتا ہوں۔ اس نے میرے بہت سے بل نکال دیئے۔ اور چند پیچ در پیچ تجربات سے گزر کر زندگی کا رخ کسی قدر بدل گیا۔ البتہ یہ حسرت ضرور باقی ہے کہ میں اس عظیم نعمت کا حق کبھی ادا نہیں کر پایا۔ بلکہ بعض اوقات تو کفران نعمت تک نوبت آتی رہی ہے۔

زندگی کے اس طرح کے باطنی تجربات اور مشاہدات کو بیان کرنے کی سکت مجھ میں نہیں۔ البتہ مختصر طور پر ان کا تھوڑا سا ذکر کرتا ہوں۔ یہ موضوع میرے لئے اجنبی ہے۔ اس لئے اپنے بیان اور اظہار میں میں نے بزرگان سلف کی تصنیفات، مکتوبات، ملفوظات اور فرمودات کی زبان اور کلام سے بے دریغ استفادہ کیا ہے۔ تجربات اور مشاہدات میرے ہیں، ان کا اظہار حتی الوسع

ان کے الفاظ میں ہے۔ تاکہ ہوا یا اپنی کم فہمی کی وجہ سے کوئی فاش غلطی نہ کر بیٹھوں۔

خاص طور پر یہ بات مجھ پر بالکل صاف اور واضح ہو گئی کہ سلوک یا تصوف میں کسی قسم کا کوئی راز یا اسرار پوشیدہ نہیں۔ اذکار، اشغال، اور مراقبات وغیرہ کوئی ڈھکی چھپی باتیں نہیں بلکہ عام طور پر جانے پہچانے معمولات ہیں جو ہر سلسلے میں اپنے اپنے طریق پر اظہر من الشمس ہیں۔ البتہ اذکار، اشغال اور مراقبات کے دوران سالک پر جو کیفیات اور مشاہدات اپنی اپنی استعداد کے مطابق وارد ہوتے ہیں ان کا ذکر کرنا بے معنی اور فضول ہے۔ اس لئے ان کا ذکر عام طور پر ممنوع قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی مثال شادی کی ہے۔ شادی کوئی خفیہ راز نہیں۔ میاں بیوی کے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے مقاصد، عوامل اور عواقب سب پر روز روشن کی طرح عیاں ہوتے ہیں۔ لیکن حجلہ عروسی کی تبدیلی روئیداد کوئی بیان نہیں کرتا۔ اور نہ ہی زندگی بھر زن وشوہر کے خلوت خانوں کی داستانیں برسرعام سنائی جاتی ہیں۔

شریعت کی طرف مائل کرنے کے لئے طریقت کا کنڈر گارٹن سکول لذت وسرور کے علاوہ بعض انتہائی خوشگوار اور پرلطف انکشافات سے مالا مال ہوتا ہے۔ سالکوں کی ایک بڑی تعداد اس لذت وسرور کی مستی میں محو ہو کر یہیں کی ہو رہتی ہے، اور اپنے اصلی مقصد یعنی شریعت کی جانب قدم بڑھانے کی بجائے جمود کا شکار ہو کر اپنی منزل کھوٹی کر بیٹھتی ہے۔ یہ بدقسمت لوگ کہیں ڈبہ پیر بن کر ابھرتے ہیں۔ کہیں مصنوعی دوکانیں سجا کر تصوف کی بلیک مارکیٹ کرتے ہیں۔ کہیں طریقت کی آڑ میں شریعت کی خلاف ورزیاں کرتے ہیں۔ ان کی پیری فقیری جعلسازی کا گورکھ دھندا ہوتی ہے اور ان کا سارا کاروبار مداریوں اور بازیگروں کی طرح شعبدہ بازی کا کرتب بن جاتا ہے۔

جو لوگ اس راہ میں ان پر کشش اور پر فریب گڑھوں میں منہ کے بل گرنے سے بچ جائیں ان کا انعام یہی ہوتا ہے کہ چلتے چلتے انجام کار ان کے قدم شریعت کی شاہراہ پر گامزن ہو جاتے ہیں، سلوک اور تصوف کا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد ہے نہ مفہوم۔

(شہاب نامہ)

زندگی اور موت کا سوال

- جب ہمارا دین مکمل، ہمارا نبی ﷺ برحق اور ہمارا قرآن اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے تو پھر ملت اسلامیہ کے زوال کی وجہ کیا ہے؟
- جب اللہ تعالیٰ نے ہم سے وعدہ فرمایا کہ اگر تم مومن ہو تو تمہیں غالب رہو گے اور یہ بھی کہ اگر اللہ تمہارا مددگار ہے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ تو پھر ہم اسقدر مغلوب ہو گئے ہیں اور رسوا کیوں ہیں؟
- مسلمان نماز بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں اور حج بھی پہلے سے زیادہ کرتے ہیں۔ بزرگوں کے مزاروں پر عرس بھی خوب شاندار طریقہ سے مناتے ہیں۔ ماہ محرم میں بھی کیا جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ علماء کی بہتات ہیں اور لاکھوں لوگ کوٹھیوں، کاروں اور کارخانوں کے مالک ہیں تو پھر یہ ذلت کیوں ہے اور یہ تنزل کیوں ہو رہا ہے؟
- ہر طاقتور ملک کی نظریں ہمارے ملکوں پر کیوں لگی ہیں اور ہر طرف خون مسلم اسقدر بے دردی اور ارزانی کے ساتھ کیوں بہایا جا رہا ہے؟
- نکبت و ادبار کی موجودہ حالت سے نکلنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں اور کونسے لائحہ عمل پر چل کر ہم اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں

دنیائے اسلام کیلئے وقت کے اس اہم ترین سوال کا تفصیلی جواب معلوم کرنے کیلئے

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ **حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ**

کی مندرجہ ذیل تصانیف ضرور پڑھیں

تعمیر ملت (اردو۔انگلش)	**چراغ راہ**	**حقیقت وحدت الوجود**
مجلد 260 صفحات قیمت-/100 روپے	مجلد 240 صفحات قیمت-/100 روپے	پلاسٹک کور قیمت-/25 روپے

ملنے کا پتہ

- ادارہ اسلامیات 190 نئی انارکلی لاہور
- مدینہ کتاب گھر اردو بازار گوجرانوالہ
- دیوا اکیڈمی پلاٹ نمبر S.T.9، بلاک نمبر 3 گلشن اقبال کراچی

براہ راست ہم سے بذریعہ وی پی منگوائیں تو ڈاک خرچ ہمارے ذمہ ہوگا۔

- مرکز تعمیر ملت سلسلہ عالیہ توحیدیہ پوسٹ بکس نمبر 500 گوجرانوالہ

بانی سلسلہ کی دیگر تصانیف

تعمیر ملت

قرون اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات
اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار
ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع
اوران کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور
واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات اور اخلاق و آداب کے اسرار و رموز اور نفسیاتی
اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔

چراغ راہ
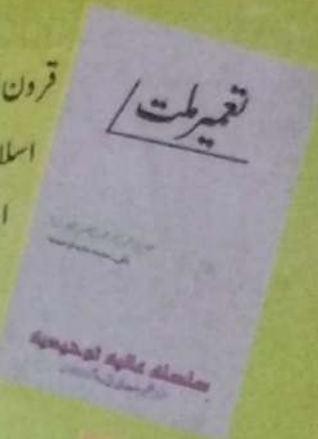
کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ
اجتماعات پر ارشاد فرمائے انمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔
سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس [illegible] سال۔
زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔
تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔
سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔

طریقت توحیدیہ
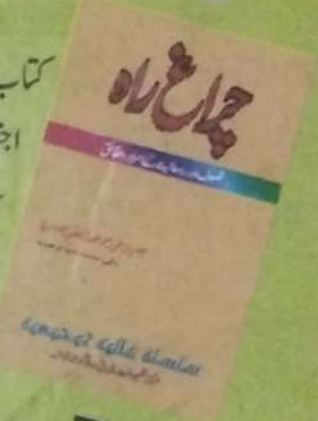
یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے
تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ
کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی
مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں وہ تمام
اوراد و اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں جس پر عمل کر کے
کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔

کتاب ہذا وحدت الوجود کے موضوع پر ایک مختصر مگر نہایت مدلل اور اہم دستاویز ہے
خواجہؒ صاحب نے ذاتی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کیا
ابن عربیؒ کے نظریہ وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وحدت شہود میں فرق۔
انسان کی بقا اور ترقی کیلئے مذہب کیوں ناگزیر ہے۔
وہ بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا۔
روحانی سلوک کے دوران تمام بزرگان عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔